بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صفحۂ جوابات وتبصرات

محمد یحییٰ بن عبدالحفیظ قاسمی

ناشر

مکتبہ نعیمہ

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں

نام کتاب	:	صفحۂ جوابات وتبصرات
مرتب	:	محمد یحییٰ بن عبدالحفیظ قاسمی
کمپوزنگ	:	رحمانی گرافکس،9270708963
صفحات	:	118
اشاعت	:	پہلا ایڈیشن2025ء
قیمت	:	
ناشر	:	مکتبہ نعیمہ، ممبئی
ملنے کے پتہ	:	ادارۂ صدیق ڈابھیل 9664918503 مکتبہ نعیمہ ممبئی 9819886832

نمبر	عناوین	صفحہ
۱	پیدل سفر حج کا حکم	۷
۲	خنثیٰ کے احکام	۱۲
۳	غیر مقلدیت اور مودودیت کے مابین فرق	۱۴
۴	کیا ربیع الاول کے مہینے میں کثرتِ درود کی تلقین بدعت ہے؟	۱۷
۵	عید میلاد النبی ﷺ پر قرآن سے استدلال اور اس کا جواب	۱۹
۶	محرم کے مہینے میں کی گئی ایک بریلوی مفتی کی تقریر کا تجزیہ	۲۱
۷	بریلوی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم؟	۲۲
۸	کیا نبی کریم ﷺ عالم الغیب ہیں؟	۲۶
۹	تعلیم وتعلم کے ساتھ تجارت مفید یا مضر؟	۲۸
۱۰	کیا مروجہ تبلیغی کام فرض عین ہے؟	۳۳
۱۱	کیا مسلمانوں میں بھی ہندوؤں کی طرح چھوت چھات اور ذات کی حد بندی ہے؟	۳۵
۱۲	مدارس کے نظام ونصاب اور ترتیب پر بے جا تبصرے کا بجا جواب	۳۷
۱۳	ایران اسرائیل جنگ مضمون وتبصرہ	۴۲
۱۴	عرب حکمراں سے بے محل خوش فہمی؛ تحریر وتبصرہ	۵۲
۱۵	دار العلوم دیوبند کے نظام تعلیم پر بے جا تبصرہ اور اس کا جواب	۵۴
۱۶	کیا قابل استعمال چیزوں کے لیے سودی قرض لینا جائز ہے؟	۵۹
۱۷	طالب علموں پر سختی کرنے کے جواز پر حدیث بدء الوحی سے استدلال	۶۱

نمبر	عناوین	صفحہ
۱۸	ایک سرسری تعارض کا جواب	۶۴
۱۹	نفلی حج عمرہ کریں یا غریبوں پر امداد؟	۶۶
۲۰	تراویح کی اجرت کے جواز پر آیتِ قرآنی سے استدلال اور اس کا جواب	۶۹
۲۱	اورنگ زیب عالم گیر اور شیوا وسنبھا	۷۰
۲۲	تقوی اور فتوی میں کیا فرق ہے؟	۸۳
۲۳	ایمان و اسلام میں امن کا پیام	۸۴
۲۴	موبائل میں قرآن شریف پڑھنے کا حکم	۸۸
۲۵	شہر نوساری کی وجہ تسمیہ	۹۱
۲۶	اسلام میں شجاعت کا مقام	۹۲
۲۷	خطا کار اس بات کا سزاوار نہیں کہ اس کا برے ناموں سے تذکرہ کیا جائے	۹۷
۲۸	تعدد ازدواج سے متعلق چند مسائل اور ان کا جواب	۹۹
۲۸	عمرہ اور زیارت کے فضائل	۱۰۳
۲۹	ساس سسر کی خدمت	۱۰۷
۳۰	قرآن خوانی کا شرعی طریقہ	۱۱۲
۳۱	اے غزہ تو ہم سے کیا چاہتا ہے؟	۱۱۴
۳۲	انسٹاگرام اور مسلمان	۱۱۶
۳۳	امہات المؤمنین ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے مبارک نام	۱۱۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقریظ

حضرت مولانا مفتی قیس صاحب قاسمی (استاذ تفسیر و حدیث مدرسہ رشیدیہ ممبئی)

الحمدللہ رب العالمین و الصلاۃ والسلام علی سید المرسلین. أما بعد!

یہ کتاب ایک گلدستہ اور گلہائے رنگا رنگ کے مضامین کا مجموعہ ہے، جن کو صدیق محترم حضرت مفتی محمد یحییٰ صاحب حفظہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے، جن میں مختلف موضوعات پر پوچھے گئے سوالات کے جوابات بھی ہیں اور مختلف عناوین پر کیے گئے تبصروں پر ناقدانہ تبصرے بھی۔

محترم موصوف نے اس کتاب میں اپنے جوابات اور تبصروں کو قرآن و حدیث اور مختلف حوالاجات کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، انداز دل کو موہ لینے والا ہے، الفاظ کا انتخاب بھی عمدہ ہے اور مضامین میں بے جا طوالت سے اجتناب بھی کیا گیا ہے، امید ہے کہ قارئین کو اس سے فائدہ ہوگا۔

حضرت مفتی محمد یحییٰ صاحب ایک مرنجامرنج شخصیت ہے، تدریسی اور دار الافتاء جیسی مقدس خدمات سے جڑے ہوئے ہیں، مختلف موضوعات پر اپنے تیکھے میٹھے تبصروں سے ہمیں نوازتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ موصوف کی اس کاوش کو قبول فرمائے، اسے ذخیرہ آخرت بنائے اور اس طرح کے مفید مضامین پر لکھنے کی مزید توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

محمد قیس داری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

الحمد لله ربّ العالمين، والصلوٰة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، محمدٍ وآله وصحبه أجمعين، أمّا بعد!

زیرِ نظر کتاب دراصل اُن مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے جو میں نے گاہے بگاہے سوالات کے جوابات میں اور مختلف علمی وفکری موضوعات پر مختصر تبصروں کی صورت میں قلم بند کیے تھے۔ یہ تحریریں زمانی اعتبار سے منتشر تھیں اور مختلف مواقع پر لکھی جانے کی وجہ سے ایک مربوط مجموعے کی شکل میں موجود نہیں تھیں۔ مناسب سمجھا کہ انہیں یکجا کر دیا جائے تاکہ قارئین ایک ہی جگہ رہنمائی، تحقیق اور تبصرہ—تینوں سے استفادہ کر سکیں۔

اس مجموعے میں جہاں سوالات کے جوابات ہیں، وہاں مختصر تحقیقی توضیحات بھی شامل ہیں، اور بعض مقامات پر ایسے تبصرے بھی ملیں گے جو حالاتِ حاضرہ، علمی نکات یا مطالعہ کے دوران سامنے آنے والے فوائد پر مشتمل ہیں۔ اس کتابچہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غیر ضروری طوالت سے گریز کیا گیا ہے اور بات کو حتی المقدور سادگی، وضاحت اور اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

میری یہ کوشش محض اصلاح اور فائدہ پہنچانے کی نیت سے ہے۔ اگر یہ مجموعہ کسی طالبِ علم، قاری یا صاحبِ فہم کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بن جائے تو میں اسے اپنی محنت کی بہترین کامیابی سمجھوں گا۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے، اسے نافع بنائے اور اسے مزید بہتری کی راہیں کھولنے کا وسیلہ بنائے۔

وما توفیقی إلا باللہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیدل سفر حج

کسی وقت ہندوستان سے یکے بعد دیگرے ایک صاحب اور پھر صاحبہ نے پیدل حج کیا، عوام کالانعام کیا اہل علم بالخصوص نو فارغین بھی ان اسفار میں دلچسپی لینے لگیں اور ایک مباحثہ کا نیا گرم بازار شروع ہوگیا تو راقم ناتواں نے مناسب سمجھا کہ اس مسئلہ پر بتوفیق الٰہی مفصل روشنی ڈالی جائے۔

پیدل سفر کرنے کا شرعی حکم: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی بہن پر چلنا بھاری تھا بعض روایتوں سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے، طبری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے: وَهِيَ امْرَأَةٌ ثَقِيلَةٌ وَالْمَشْيُ يَشُقُّ عَلَيْهَا.

ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے: إِنَّ أُخْتَهُ نَذَرَتْ أَنْ تَمْشِيَ إِلَى بَيْتِ اللهِ وَشَكَا إِلَيَّ ضَعْفَهَا.

انھوں نے یہ بھی نذر مانی تھی کہ ننگے پاؤں، ننگے سر اور چل کر حج کروں گی۔

كَمَا فِي رِوَايَةِ الطَّبْرَانِيِّ: نَذَرَتْ أَنْ تَمْشِيَ إِلَى الْكَعْبَةِ حَافِيَةً حَاسِرَةً۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: لِتَمْشِ وَلْتَرْكَبْ كَمَا فِي رِوَايَةِ النَّسَائِيِّ۔

یعنی قدرت کے وقت میں چلیں اور عجز کے وقت میں سوار ہوجائیں۔ (قالہ النووی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوپٹا لینے کا حکم فرمایا کیوں کہ ننگے سر حج کرنے کی نذر، نذر معصیۃ ہے اور ننگے پیر چلنا ایک مباح امر ہے جس کی نذر نہیں ہوتی ہے یا وہ اپنے آپ کو بہت زیادہ تکلیف میں ڈالنا ہے اس لیے اس کو بھی باقی نہیں رکھا گیا۔

ایک حدیث میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی خطبہ دیتے تو صدقہ کا حکم فرماتے اور ''مثلہ'' (آنکھ کان ناک کاٹ کر منہ بگاڑنا) سے منع فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ''مثلہ'' میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی پیدل حج کرنے کی نذر مانے۔ اگر کسی نے پیدل حج کرنے کی نذر مان لی ہے تو وہ ہدی (دم، قربانی) دے کر سوار ہوجائے۔ (مستدرک)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھے شخص کو فرمایا (جس نے بیت اللہ کی طرف پیدل چلنے کی

نذر مانی تھی اور دو لوگوں کا سہارا لیے چل رہا تھا): اے بوڑھے شخص سوار ہو جایئے، یقیناً اللہ تعالیٰ آپ سے اور آپ کی نظر سے بے نیاز ہے اور ایک روایت میں ہے: یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے اپنے نفس کو عذاب دینے سے بے نیاز ہے۔ (بخاری)

اس روایت کے مختلف الفاظ پر نظر ڈالیے جب حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا جواب عنایت فرمایا؛ إِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنْ مَشْيِ أُخْتِكَ. (بیہقی)

مُرْهَا فَلْتَرْكَبْ إِذَا لَمْ تَسْتَطِعْ أَنْ تَمْشِيَ إِلَى الْبَيْتِ فَمَا أَغْنَى أَنْ يَشُقَّ عَلَى أُخْتِكَ. (حاکم)

إِنَّ اللهَ لَا يَصْنَعُ بِشَقَاءِ أُخْتِكَ شَيْئًا فَلْتَحُجَّ رَاكِبَةً. (حاکم)

ایک شخص دو لوگوں کے سہارے چل رہا تھا آپ نے دیکھ کر فرمایا: إِنَّ اللهَ لَغَنِيٌّ عَنْ تَعْذِيبِ هَذَا نَفْسَهُ وَأَمَرَهُ أَنْ يَرْكَبَ. (ابوداؤد)

(ماخوذ از ذخیرۃ العقبی)

ان مختلف طرق سے آنے والے مختلف الفاظ کیا اس بات پر دلالت نہیں کرتے کہ حج ماشیاً کی شریعت میں تحریض نہیں ہے؟

اس طرح کی مشقت والے کام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں ابھارا۔ بلکہ ایسے کاموں کی حوصلہ شکنی کے ہے اگر پیدل حج مستحب ہوتا تو کسی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی وضاحت کرتے یا خود عمل کر کے بیان فرماتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرضیت کے بعد ایک حج کیا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بھی عبادت افضل ہیئت پر کرتے تھے۔ خصوصاً تب جب وہ عبادت آپ نے زندگی میں ایک مرتبہ کی ہو۔ پھر آپ نے اہتمام سے فرمایا: مجھ سے اپنی حج کی عبادت سیکھ لو۔

وَكَانَ يُوَاظِبُ فِي مُعْظَمِ الْأَوْقَاتِ عَلَى الصِّفَةِ الْكَامِلَةِ، فَأَمَّا مَا لَمْ يَفْعَلْهُ إِلَّا مَرَّةً وَاحِدَةً، فَلَا يَفْعَلُهُ إِلَّا عَلَى أَكْمَلِ وُجُوهِهِ، وَمِنْهُ الْحَجُّ، فَإِنَّهُ لَمْ يَحُجَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الْهِجْرَةِ إِلَّا حَجَّةً وَاحِدَةً بِإِجْمَاعِ الْمُسْلِمِينَ، وَهِيَ حَجَّةُ الْوَدَاعِ، وَقَدْ قَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: {لِتَأْخُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ} وَلِأَنَّهُ أَعْوَنُ لَهُ عَلَى الْمَنَاسِكِ كَمَا سَبَقَ وَاللهُ أَعْلَمُ.

حجَّ أَنَسٌ على رَحْلٍ، وَلَمْ يَكُنْ صَحيحًا، وَحَدث أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ حجَّ على رَحْلٍ، وكانت زامِلَةً. رواه البخاري، واللهُ أعلَمُ. (المجموع شرح المهذب)

ایک قولی روایت بھی ہے حضرت عمران رضی اللہ عنہ کی: قَالَ النبی ﷺ مَنْ نَذَرَ أَحَدُكُمْ أَنْ يَحُجَّ مَاشِيًا فَلْيُهْدِ هَدْيًا وَلْيَرْكَبْ. (فتح وفیہ انقطاع)

بعض حضرات فرماتے ہیں پیدل حج کرنے میں مشقت زیادہ ہے اس لیے پیدل حج کرنا کمال کی بات ہے، عبادت میں جتنی مشقت ہوتی ہے اتنا ہی ثواب ملتا ہے۔

ظاہر ہے یہ اثباتِ کمال ایک امرِ اجنبی سے ہے علماء نے لکھا ہے ”كَثْرَةُ الْمَشَقَّةِ لَيْسَتْ مَطْلُوبَةً بِنَفْسِهَا“ (مشقت کی کثرت بذات خود مقصود نہیں ہے) بہت سی حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنے سے منع فرمایا، اور آپ ﷺ نے کسی عمل سے امت پر مشقت آئے اس سے احتراز کیا ہے، جیسے مسواک کا لزومی حکم، تہائی رات تک عشاء کی نماز کو موخر کرنے کا حکم، تراویح کی جماعت پر مواظبت۔

افضل صدقہ بھی اسے فرمایا ہے کہ جس کے بعد وہ مستغنی باقی رہے صدقہ کرنے کی وجہ سے اس کے اوپر مشقت نہ آئے۔ (خير الصدقة عن ظهر غنى)

اگر کسی کو اصل عبادت میں مشقت پیش آگئی تو اس مشقت سے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے جیسے کوئی اٹک اٹک کر قرآن کریم پڑھتا ہے وہ بغیر اٹکے پڑھ نہیں پاتا اس مشقت پر ثواب زیادہ ہے، اور جیسے کسی نے جہاد کیا اس کی سواری بھی ہلاک اور مجاہد خود بھی شہید۔ یہ اصل عبادت میں مشقت ہے اور یہ مطلوب ہے۔

علماء نے ان حضرات کی تردید کی ہے جو سند نازل کو افضل اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس سند نازل میں رواۃ کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے چھان پھٹک میں، رواۃ کی تحقیق میں مشقت زیادہ ہوگی لہٰذا سند نازل افضل ہے۔ تو علماء نے یہ کہہ کر تردید کی ہے کہ یہ ایک امر اجنبی سے ترجیح دینا ہے جس کا اصل مقصود سے (تصحیح وتضعیف سے) کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے مسجد جائے اور دور کا راستہ اختیار کرے تاکہ قدم زیادہ ہوں اور ثواب زیادہ ملے ہر چند کہ اس کے نتیجے میں جماعت چھوٹ جائے یا وہ تھکا ماندہ مسجد میں پہنچے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ جو کمزور ہو اور چلنے سے اس کے اخلاق بگڑ جائیں وہ بدمزاج ہو جائے تو ایسے شخص کے لیے چل کر حج کرنا افضل نہیں ہوسکتا۔

تو ظاہر ہے ہمارے زمانے میں جب کہ سہولتیں موجود ہیں لوگ چند گھنٹوں میں مکہ مکرمہ پہنچ سکتے ہیں تو کوئی شخص پیدل چل کر بہت سی مشقتیں لازم کر کے اپنی طبیعت اور جان کو خطرے میں ڈال کر حج کے لیے جائے تو یہ کیوں کر افضل ہوگا اور ایک اہم بات جس کی طرف مولانا مفتی سلمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم نے متوجہ کیا کہ ہندوستان میں چونکہ چلنا عبادت تصور کیا جاتا ہے لہٰذا ہندوؤں کے کاوڑ، رتھ چلتے ہیں اور اسی چلنے کو وہ عبادت سمجھتے ہیں تو ہندوستان میں اس طرح چلنا حج کے لیے یہ ان کی مشابہت کی وجہ سے خرابی کا باعث بنے گا۔

اور یہ کہنا کہ قران کریم کی آیت يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ میں پاپیادہ کا ذکر پہلے ہے اس لیے وہ افضل ہے، اس معنی کر صحیح نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ حج کرتے تھے لیکن سوار نہیں ہوتے تھے پیدل حج کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس میں پا پیادہ کا ذکر بھی کیا۔ (قالہ الجاھد فی احکام القران)

احکام القرآن میں ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے منقول ہے کہ یہ آیت پیدل اور سوار حج کرنے کی اباحت پر دلالت کرتی ہے اس میں افضلیت پر کوئی دلالت نہیں ہے اور پھر ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ ہی کے حوالے سے افضلیت پر دلالت کرتے ہوئے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی بہن کو جنھوں نے بیت اللہ تک چلنے کی نذر مانی تھی حکم دیا کہ سوار ہو جائیں اور دم دیں تو دم دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ چلنا عبادت ہے جس کی نذر منعقد ہوگئی تھی ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دم کا حکم نہ فرماتے۔

علامہ ظفر احمد تھانوی نے اس پر رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے جس میں ایک عورت نے برہنہ، بال کھلے رکھ کر حج کرنے کی نذر مانی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ کپڑے پہنے اور دم دے تو اس حدیث سے جس طرح برہنہ حج کا عبادت ہونا ثابت نہیں ہوتا اسی طرح حدیث عقبہ سے چلنا عبادت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ (اعلاء السنن)

مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بیت اللہ کی طرف پیدل چلنے کی نذر احناف کے ہاں اصول کے مطابق خلاف قیاس ہے، کیونکہ احناف کے نزدیک ان چیزوں کی نذر درست

ہے جو عبادات مقصودہ میں داخل ہوں، جب کہ چلنا بذات خود کوئی عبادت مقصودہ نہیں ہے، لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ نذر صحیح نہیں ہونی چاہیے، لیکن اس سے متعلق احادیث صریحہ کے ہونے کی وجہ سے خلاف قیاس اس نذر کو درست قرار دیا گیا ہے۔

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خلاف قیاس استحسانا اس نذر کو اس لیے درست قرار دیا گیا ہے کہ عرف و عادت میں یہ کام یعنی بیت اللہ کی طرف چل کر جانا التزام احرام سے کنایہ ہے۔ (نفحات)

معلوم ہوا کہ صرف چلنا عبادت مقصودہ نہیں ہے لہٰذا اس میں اپنے آپ کو تھکانا غیر مقصود ہوگا۔

پیدل حج کرنے کے سلسلے میں کچھ آثار بھی ہیں جن کو اعلاء السنن میں نقل کیا گیا ہے جن پر ہلکی پھلکی جرح بھی منقول ہیں لیکن وہ ناقابل قبول نہیں ہیں۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار ہو کر سفر حج کیا اور بعد میں صحابہ کا بھی یہی طرز تھا کہ وہ سوار ہو کر حج کرتے تھے اور یہی تعامل وتوارث رہا لہٰذا اکثر حضرات اسی کو افضل قرار دیتے ہیں۔ علامہ ظفر احمد تھانوی نے یہ بات لکھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے زمانے میں لوگ چوں کہ پیادہ حج کرتے تھے اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تردید میں سوار ہو کر حج فرمایا تو ہمارے زمانے میں کچھ لوگ پیدل چلنے کو عبادت سمجھتے ہیں تو ان کی مشابہت سے بچتے ہوئے اور عملاً ان کی تردید کرتے ہوئے سوار ہو کر سفر حج افضل ہوگا۔

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وَمُعْظَمُ الْعِرَاقِيِّينَ أَنَّ الرُّكُوبَ أَفْضَلُ، لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَجَّ رَاكِبًا، وَلِأَنَّهُ أَعْوَنُ عَلَى الْمَنَاسِكِ وَالدُّعَاءِ وَسَائِرِ عِبَادَاتِهِ فِي طَرِيقِهِ، وَأَنْشَطُ لَهُ، وَالثَّانِي وَهُوَ مَشْهُورٌ فِي كُتُبِ الْخُرَاسَانِيِّينَ، فِيهِ قَوْلَانِ أَصَحُّهُمَا هَذَا، وَالثَّانِي الْمَشْيُ. (المجموع شرح المهذب)

علامہ ظفر احمد تھانوی فرماتے ہیں: وَقَدِ اخْتَلَفَتِ الرِّوَايَاتُ فِي الْمَذْهَبِ، فَذَكَرَ مُحَمَّدٌ فِي "الْأَصْلِ": (إِذَا نَذَرَ) يُخَيَّرُ بَيْنَ الرُّكُوبِ وَالْمَشْيِ، لِأَنَّ الْحَجَّ رَاكِبًا أَفْضَلُ، وَيُكْرَهُ مَاشِيًا. وَفِي الْجَامِعِ الصَّغِيرِ أَشَارَ إِلَى وُجُوبِ الْمَشْيِ، حَيْثُ قَالَ: لَا يَرْكَبُ حَتَّى يَطُوفَ طَوَافَ الزِّيَارَةِ، وَفِيهِ إِشَارَةٌ إِلَى الْوُجُوبِ. (اعلاء السنن)

خنثیٰ کے احکام

ایک خاتون نے خُنثیٰ کے متعلق معلوم کیا کہ مجھے ان میں دینی اعتبار سے محنت کرنا ہے براہ کرم ان کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں مطلع فرمائیں:

جواب: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ، وَالْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ. (الحدیث)

وَقَالَ اللهُ تَعَالَى: يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ. قال ايضا الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا.

وَقَالَ أَيْضًا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ.

ان آیتوں میں حکم سب کو دیا گیا ہے کہ اے لوگوں اے انسانوں چاہے وہ انسان کامل ہو یا ناقص ہو، اپاہج ہو یا وہ صحیح سالم ہو، تمام عضو کامل ہو یا کچھ عضو ناقص ہو۔

جس طرح کوئی اپاہج کوئی نابینا اللہ تعالیٰ کے حضور یہ عذر نہیں کرسکتا کہ میں اپاہج تھا اندھا تھا اس لیے اسلام پر چلنے سے معذور تھا اسی طرح کوئی خنثیٰ/ ہیجڑا کسی طرح کا کوئی عذر نہیں کرسکتا۔

خنثیٰ بھی انسانی افراد میں کا ایک فرد ہے، ہمارے سماج کا ایک حصہ ہے۔ لوگوں کا ان کو حقیر سمجھنا سخت گناہ ہے اور ان کا اپنے آپ کو سماج سے الگ تھلگ تصور کرنا سخت غلط بات ہے، اسلام میں ان کے لیے مکمل رہنمائی اور کامل عزت اور دائمی کامیابی ہے۔

Transgender جو اردو میں ہیجڑا اور عربی میں خنثیٰ کہا جاتا ہے۔

وہ شخص ہے جس کو ذکر و فرج (مرد و عورت دونوں کی شرمگاہ) ہو یا دونوں میں سے کوئی نہ ہو۔ وَهُوَ ذُو فَرْجٍ وَذَكَرٍ أَوْ مَنْ عُرِيَ عَنِ الْاِثْنَيْنِ جَمِيْعًا. (درمختار، کتاب الخنثی، اشرفی دیوبند، ۱۰/۳۶۹) پیدائش کے بعد اگر بچہ ذکر سے پیشاب کرے تو مذکر اور فرج سے پیشاب کرے تو مونث ہوگا اور دوسری شرمگاہ کو عضو زائد یا شگاف زائد سمجھا جائے گا، اور اگر دونوں اعضاء سے یکے بعد دیگرے پیشاب آتا ہو تو جس عضو سے پہلے پیشاب نکلتا ہو اُسی کا اعتبار ہوگا اور اگر دونوں سے ایک ساتھ پیشاب آتا ہو تو بلوغ تک ''خنثیٰ'' مشکل کہلائے گا اور بلوغ کے بعد اگر مرد کی طرح خواب میں عورت سے ہمبستری کرے اور احتلام ہو یا داڑھی نکل آئے تو اسے مذکر سمجھا جائے گا اور اگر نسوانی علامات پائی جائیں مثلاً عورت کی طرح پستان ابھر آئیں، یا

پستان میں دودھ اتر آئے یا حیض آنے لگے یا حاملہ ہو جائے تو مونث سمجھا جائے گا اور اسی حیثیت سے احکام جاری ہوں گے۔ اگر دونوں آلے موجود ہوں تب تو مذکورہ بالا علامتیں دیکھی جائیں گی لیکن اگر دونوں میں سے کوئی آلہ نہ ہو، اور پیشاب کسی سوراخ سے آتا ہو جس کی شکل نہ ذکر کی ہے نہ فرج کی تو ایسا شخص بھی خنثیٰ مشکل کہلائے گا اسی طرح علامات متعارض ہونے کی صورت میں بھی خنثیٰ مشکل کہلائے گا۔ خلاصہ یہ کہ اگر علامات سے مذکر ہونا واضح ہو جائے تو مذکر کے احکام جاری ہوں گے اور اگر علامات سے مونث ہونا واضح ہو جائے تو مونث کے احکام جاری ہوں گے۔ اور اگر خنثیٰ مشکل ہونا ثابت ہو جائے تو تو احتیاطی احکام جاری ہوں گے اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دوپٹہ وغیرہ سے سر چھپا کر نماز پڑھے اور نماز میں عورت کے بیٹھنے کی طرح بیٹھے، ریشمی کپڑا اور زیور نہ پہنے، حالت احرام میں سلا ہوا کپڑا پہنے، اور کسی مرد یا عورت کے سامنے ستر نہ کھولے اور بغیر محرم کے سفر نہ کرے اور کسی نامحرم مرد یا عورت کے ساتھ خلوت نہ کرے، اور انتقال ہو جائے تو غسل نہ دیا جائے بلکہ تیمم کرا دیا جائے اور پانچ کپڑوں میں کفن دیا جائے اور دفن کے وقت قبر کا پردہ کر لیا جائے۔ (فتاوی دار العلوم، بحوالہ مجمع الانھر)

واضح رہے کہ کسی مرد یا عورت کا اپنی جنس کو بذریعہ آپریشن تبدیل کر دینا ناجائز اور ملعون عمل ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی خلقت و بناوٹ کو بدلنا، فطرت سے بغاوت کرنا، مذموم وشیطانی حرکت کا ارتکاب کرنا، اور تخلیقِ الٰہی کو چیلنج کرنا ہے، شریعتِ اسلامیہ میں اس کی اجازت نہیں۔

قرآنِ کریم میں ہے:

{فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ} [سورۃ الروم:۳۰]

''اللہ کی فطرت پر قائم رہو، جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اس کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں''۔

اور حدیثِ پاک میں ہے کہ اللہ پاک نے خلقت میں تبدیلی کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے، نیز جب خوب صورتی کے لیے یا کم عمر دکھانے کے لیے پلاسٹک سرجری کروانا، اور عورتوں کا مردوں کے ساتھ، یا مردوں کا عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا، ناجائز وممنوع ہے، تو جنس کو تبدیل کرنا، بدرجۂ اولیٰ ناجائز اور حرام ہے، ایسے ناجائز تصرفات کی اجازت انسانوں میں حیوانیت اور درندگی کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہوگا۔ (از فتاوی بنوریہ)

غیر مقلدیت اور مودودیت کے مابین فرق

سوال: غیر مقلدیت اور مودودیت کے درمیان فرق کیا ہے حالانکہ یہ دونوں فرقے غیر مقلد ہیں ؟اس بارے میں کوئی مضمون یا کتاب ہو تو برائے مہربانی ارسال فرمائیں۔

جواب: غیر مقلدین:اہل سنت والجماعت کے نزدیک دین کے اصول چار ہیں؛ کتاب اللہ ، سنت ، اجماع اور قیاس۔

پہلے اہل القرآن (منکرین حدیث، خوارج) آئے، انھوں نے کہا مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللهِ اتَّبَعْنَاهُ، حَسْبُنَا الْقُرْآنُ ترجمہ: جو ہم اللہ کی کتاب میں پائیں گے اسی کی اتباع کریں گے، ہمارے لیے قرآن ہی کافی ہے۔ کہہ کر حدیث کے حجت ہونے کا انکار کر دیا۔

پھر کچھ زمانہ بعد غیر مقلدین کا وجود ہوا، انھوں نے کتاب اللہ کو بھی حجت مانا اور احادیث کو بھی لیکن اجماع کا انکار کر دیا، اجماع کا ثبوت تو مضبوط دلائل سے ہے اس لیے یہ کہا: ''ہم قطعی اجماع کو مانتے ہیں، ظنی کو نہیں'' (ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا)

اسی وجہ سے غیر مقلدین بہت سے اجماعی مسئلہ میں جمہور مسلمان سے اختلاف کرتے ہیں، حالاں کہ اس مسئلہ میں صحابہ کا اجماع ہوتا ہے اگرچہ سکوتی ہوتا ہے۔ لیکن وہ اسی راہ پر چلنا پسند کرتے ہیں جو جمہور سے ہٹ کر ہوتی ہے۔

پھر انھوں نے قیاس کی حجیت کا بھی انکار کیا اور اس کے نتیجہ میں ان کو تقلید کا بھی انکار کرنا پڑا۔ حالاں تقلید کے بغیر چار قدم چلنا مشکل ہے لہٰذا انھوں نے کہا کہ تقلید شخصی نہیں ہونی چاہیے۔ (ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا)

حدیث میں بھی وہ صرف صحیح وحسن حدیث کو حجت مانتے ہیں، ضعیف حدیث کو موضوع کے کھاتے میں رکھ کر ناقابل عمل گردانتے ہیں۔

شیخ فرماتے ہیں ''برعکس نام نہند زنگی کافور'' (الٹا نام رکھو کوئی شک نہیں کرے گا)

یعنی یہ حضرات عاملینِ حدیث کم اور تارکینِ حدیث زیادہ ہیں، اور اپنا نام اہل حدیث رکھ دیا کہ کوئی ترک حدیث کہ سلسلے میں ان پر شک نہ کرے۔

ان سے ایک بڑا اختلاف صفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں ہے وہ اس مسئلہ میں فرقۂ مشبہ کے قریب ہیں۔

مودودیت: اور مودودیت چوں چوں کا مربع ہے؛ یہ فرقہ نہ کسی چیز کا انکار کرتا ہے نہ کسی چیز کو پورے طور پر اختیار کرتا ہے، نہ تقلید کا بالکلیہ انکار کرتا ہے نہ اجماع کا نہ قیاس کا۔ اس کا ماننا یہ ہے کہ جہاں سے عقل میں آتی، دل لگتی بات ملے لے لو۔

گمراہی کے اسباب میں سے ایک سبب عقل کو نقل پر مقدم کرنا ہے، اور یہ اسی کی مرتکب ہیں اسی وجہ سے جمہور سے بہت سے مسائل میں اختلاف کر کے بالکل الگ راہ اختیار کر لی ہے، اس فرقہ کو سمجھنے کے مفتی یوسف صاحب تاولی مدظلہ (استاذ دار العلوم دیوبند) کی یہ عبارت کافی ہے جو انھوں نے ''جواہر الفرائد'' میں درج کی ہے۔

''مودودی فرقہ جو اپنے آپ کو جماعت اسلامی کے نام سے موسوم کرتا ہے، صحابہ کی شان میں گستاخ ہونے کے سلسلہ میں شیعوں سے ملتا جلتا ہے اور صحابہ کو معیار حق نہ ہونے کا عنوان دے کر دین کو مجروح کرنا اس فرقہ کا مقصد ہے اور پھر اس لغو جملہ کی تصحیح کے لئے تاویلات رکیکہ فاسدہ پیش کی گئی ہیں۔ جب صحابہ کو مجروح کیا جائیگا تو (سارا دین ہم کو صحابہ کے واسطے سے پہنچا ہے) پھر سارے دین کے اوپر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے، بعض سیدھے سادے مسلمان اس کی دلفریب زہر بھری ہوئی عبارات دیکھ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں، اس جماعت کو پہچاننے کے لئے بس یہ بات کافی ہے کہ اس کا مقصد صحابہ اور سلف کے اوپر سے اعتماد اٹھانا ہے اور دین کی حقیقت وہ ہے جس کو ابوالاعلیٰ مودودی نے سمجھی ہے اور ساری امت نہ قرآن کو سمجھ سکی اور نہ احادیث کو، نہ قرآن کو وہ سمجھے جو اس کے مخاطبین اولین ہیں، بس اس کو صرف ابوالاعلیٰ مودودی نے سمجھا ہے۔ جب اس جماعت کے لٹریچر کو دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فرق ضالہ سابقہ کا کشکول مرکب ہے، کوئی بات شیعہ کی اور کوئی خوارج کی اور کوئی معتزلہ کی اور کوئی کسی دوسرے فرقہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس جماعت کے دجل و فریب سے محفوظ رکھے۔'' [۶۳۹]

غیر مقلدیت اور مودودیت کے درمیان کئی بنیادی فرق پائے جاتے ہیں، اگرچہ دونوں ہی تقلید کے فی الجملہ مخالف ہیں۔

غیر مقلدیت (اہل حدیث): غیر مقلدیت سے مراد وہ مکتب فکر ہے جو چاروں فقہی مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) میں سے کسی ایک کی تقلید کو ضروری نہیں سمجھتا اور براہِ راست قرآن و حدیث سے استدلال کرتا ہے۔ ان کے نزدیک اجتہاد ہر دور میں ممکن ہے اور وہ کسی ایک امام

کی پابندی کو غلط سمجھتے ہیں۔

اہم عقائد و نظریات: تقلیدِ شخصی کو غلط سمجھنا، براہِ راست قرآن و حدیث سے مسائل اخذ کرنا، اجماع و قیاس کی مخالفت، فقہ حنفی پر شدید تنقید۔

مودودیت (مولانا مودودی کا نظریہ): مودودیت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار و نظریات پر مبنی ایک فکری تحریک ہے، جو زیادہ تر اجتماعی اور سیاسی مسائل پر زور دیتی ہے۔ یہ تحریک اسلامی حکومت اور خلافت کے قیام پر خاص توجہ دیتی ہے۔

اہم عقائد و نظریات: دین کو محض انفرادی عبادات تک محدود نہ رکھنا بلکہ اجتماعی و سیاسی نظام میں نافذ کرنا، اسلامی ریاست کا قیام اصل ہدف قرار دینا، فقہی تقلید کو ضروری نہ سمجھنا لیکن روایتی اہل حدیث مکتبِ فکر سے مختلف ہونا، اجتہاد کی گنجائش تسلیم کرنا اور جدید مسائل پر غور و فکر کرنا۔

کتب و مضامین: اگر آپ اس موضوع پر مزید تفصیل چاہتے ہیں، تو درج ذیل کتب مفید ہوسکتی ہیں:

غیر مقلدیت اور اس کی حقیقت	مولانا سرفراز خان صفدر
تحریکِ مودودیت پر ایک نظر	مولانا یوسف لدھیانوی
مودودیت کا علمی و فکری جائزہ	مفتی تقی عثمانی
غیر مقلدیت کے اثرات	مولانا منظور احمد نعمانی

کیا ربیع الاوّل کے مہینے میں کثرتِ درود کی تلقین بدعت ہے؟

ربیع الاول کے مہینے میں ایک عالم شخص نے لوگوں کو کثرتِ درود شریف کی ترغیب دی تو ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا۔

سوال: درود شریف یقیناً بہت بڑی عبادت ہے جتنا پڑھیں گے اتنا نفع ہی نفع ہے لیکن جس عبادت کا شریعت نے خاص مہینے میں خاص عدد مقرر نہیں کیا تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اسکو مقرر کریں ایسی ہی چیزیں آگے چل کر بدعت بنتی ہیں نافع بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بغل میں چھینک آنے کے بعد کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ. حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس دعا میں زیادتی کو بدعت قرار دیتے ہوئے فرمایا: وَلَيْسَ هٰكَذَا عَلَّمَنَا رَسُولُ اللّٰهِ، عَلَّمَنَا أَنْ نَقُولَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ. کہ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے نہیں سکھایا بلکہ یہ کہا ہے کہ جب چھینک آئے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ کہو۔ (مستدرک الحاکم ۴؍۲۶۵-۲۶۶ سنن الترمذی: ۲۷۳۸)

جواب: علامہ عثمانی رحمہ اللہ نے بدعت کی تعریف کی ہے: إِنَّ الْبِدْعَةَ الشَّرْعِيَّةَ هِيَ إِحْدَاثُ أَمْرٍ لَيْسَ لَهُ ثُبُوتٌ بِوَاحِدٍ مِنَ الْأُصُولِ الْأَرْبَعَةِ الدِّينِيَّةِ، زَاعِمًا أَنَّهُ مِنَ الدِّينِ، وَمَظِنَّةً لِلثَّوَابِ مِنَ اللّٰهِ وَالتَّحْسِينِ.

بعض حضرات نے بدعت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ہر وہ طریقہ بدعت ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولا ''فعلا''، ''دلالتا'' یا ''اشارۃ'' کسی طرح سے ثابت نہ ہو، نہ عہد صحابہ میں اس کا کوئی پتا ہو اس کی ضرورت کے باوجود، اس کو امرِ دین اور کارِ ثواب سمجھ کر اختیار کیا جائے، اور یہ کمی و زیادتی اصل دین میں ہو اس کا تعلق ذرائع اور وسائل سے نہ ہو۔

بہرحال اس تعریف کی رو سے اگر کوئی ربیع الاول کے مہینے میں درود شریف کو دین میں داخل کرے گا بایں طور کہ ربیع الاول کے مہینے میں اتنی مقدار درود شریف کی پڑھنا خاص فضیلت رکھتا ہے یا ربیع الاول میں درود شریف پڑھنے کی جو فضیلت ہے وہ دوسرے مہینوں میں نہیں ہے۔ تو یہ بدعت ہے، اور یہ ایک امر مباح غیر مؤقت کو اپنی طرف سے حد بندی کرنا ہے اور احداث فی الدین ہے۔

لیکن اگر کوئی اس مہینے کی مناسبت سے لوگوں کو بس ترغیب دے، کسی امر زائد کو ثابت نہ کرے

جس طرح اس مہینے کی مناسبت سے سیرت پر بیان کیا جاتا ہے، تو اس کو بدعت کہنا دشوار ہے۔
ہاں امر مباح کے لیے تداعی احناف کے یہاں درست نہیں، لیکن بذریعہ میسج لوگوں کو درود شریف کے لیے ابھارنا تداعی میں نہیں آئے گا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے جو بات نقل کی گئی ہے وہ مکمل اس طرح ہے: عن نافعٍ أَنَّ رَجُلًا عَطَسَ إِلَى جَنْبِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: وَأَنَا أَقُولُ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ، وَلَيْسَ هٰكَذَا عَلَّمَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، عَلَّمَنَا أَنْ نَقُولَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ. (ترمذی)

اس حدیث میں ایسا نہیں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کو بدعت قرار دیا ہو یا نکیر فرمائی ہے، ہاں وہ الفاظ کہنے کی تاکید ہے جو نبی کریم ﷺ سے قولاً ثابت ہیں۔ اس حدیث سے نہایت درجہ کی اتباع ثابت ہوتی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ پر اضافہ اگر بدعت ہوتا تو دوسری حدیث سے ثابت نہ ہوتا، چناں چہ ایک حدیث میں اضافہ ثابت ہے: أَخْرَجَ أَبُو جَعْفَرٍ الطَّبَرِيُّ فِي التَّهْذِيبِ بِسَنَدٍ لَا بَأْسَ بِهِ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: عَطَسَ رَجُلٌ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ: يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، وَعَطَسَ آخَرُ فَقَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ حَمْدًا طَيِّبًا كَثِيرًا مُبَارَكًا فِيهِ، فَقَالَ: ارْتَفَعَ هٰذَا عَلَى هٰذَا تِسْعَ عَشْرَةَ دَرَجَةً.

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جو نکیر فرمائی تھی اس کی وجہ کیا تھی تو علامہ مبارک پوری لکھتے ہیں: يَحْتَمِلُ أَنْ يَكُونَ مِنْ جَهْلِهِ بِالْحُكْمِ الشَّرْعِيِّ، أَوْ ظَنَّ أَنَّهُ يُسْتَحَبُّ زِيَادَةُ السَّلَامِ عَلَيْهِ لِأَنَّهُ مِنْ جُمْلَةِ الْأَذْكَارِ. یعنی یا تو کہنے والے کو حکم شرعی معلوم نہیں تھا یا اس وجہ سے کہ لفظِ سلام کے اضافہ کو اس نے چھینک کی دعا میں مستحب گمان کرلیا تھا۔ لہٰذا اگر کوئی اس موقع پر سلام کو مستحب سمجھے یا احکام ہی سے ناواقف ہو تو اس کو نکیر کی جائے گی۔

مبارک پوری صاحب بھی سلام کے اضافہ کو بدعت نہیں بلکہ غیر مستحسن قرار دیتے ہیں:
فَالزِّيَادَةُ الْمَطْلُوبَةُ إِنَّمَا هِيَ الْمُتَعَلِّقَةُ بِالْحَمْدَلَةِ سَوَاءٌ وُرِدَ أَوْ لَا، وَأَمَّا زِيَادَةُ ذِكْرِ آخَرَ بِطَرِيقِ الضَّمِّ إِلَيْهِ فَغَيْرُ مُسْتَحْسَنٍ؛ لِأَنَّ مَنْ سَمِعَ رُبَّمَا يَتَوَهَّمُ أَنَّهُ مِنْ جُمْلَةِ الْمَأْمُورَاتِ.

عید میلاد النبی ﷺ پر قرآن سے استدلال اور اس کا جواب

سوال: بریلویوں کی اس دلیل کا جواب مطلوب ہے۔

رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِاَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ. ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر آسمان سے ایک بھرا ہوا خوان اتار دیجیے جو ہمارے اگلے اور پچھلوں کے لیے عید کا دن قرار پائے اور آپ کی طرف سے نشانی ہوجائے۔

آسمان سے صرف دسترخوان اترنے کو اولین و آخرین کی عید کہا گیا ہے۔تو رحمت عالم ﷺ کی پیدائش کے دن کو جو کہ دسترخوان اترنے کے دن سے بہت ہی زیادہ افضل تھا اس کو عید کہنے میں کیا حرج ہے.؟؟

جواب: لغت میں عید کا مطلب ہے:''بار بار لوٹنے والی خوشی یا اجتماع''

شرعی اصطلاح میں عید سے مراد ہے:شرعی شعائر کے طور پر مقررہ دن جس میں عبادات ومخصوص اعمال مشروع ہوں۔

قرآن میں''عید''لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے (یعنی خوشی اور یادگار دن کے طور پر)، نہ کہ شریعتِ محمدیہ کے''اصطلاحی عید'' کے معنی میں۔

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اسلام میں صرف دو عیدیں ہیں: عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَدِمَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِينَةَ، وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُونَ فِيهِمَا - كَعَادَةِ الْأُمَمِ (الرُّومِ وَالْفُرْسِ) كُلُّ أُمَّةٍ لَهَا أَعْيَادٌ، فَكَانَ لِلعَرَبِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ يَوْمَانِ يَلْعَبُ فِيهِمَا أَهْلُ الْمَدِينَةِ- فَقَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا هَذَانِ الْيَوْمَانِ؟

فَقَالُوا: كُنَّا نَلْعَبُ فِيهِمَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ، فَقَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللهَ قَدْ أَبْدَلَكُمْ بِهِمَا خَيْرًا مِنْهُمَا، يَوْمَ الْأَضْحَى وَيَوْمَ الْفِطْرِ. (رواہ ابو داود)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہلِ مدینہ کے ہاں دو دن تھے جن میں وہ کھیل تماشا کرتے تھے — جیسا کہ روم اور فارس کی قوموں

کی عادت ہے کہ ہر قوم کے کچھ تہوار ہوتے ہیں — عرب میں بھی زمانۂ جاہلیت کے دو دن تھے جن میں اہلِ مدینہ کھیلتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا: ''یہ دونوں دن کون سے ہیں؟'' انہوں نے عرض کیا: ''ہم زمانۂ جاہلیت میں ان دو دنوں میں کھیلتے تھے۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان دونوں کے بدلے ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں: عید الاضحیٰ کا دن اور عید الفطر کا دن۔''

رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ.

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کے جواب میں فرمایا: إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ.

اللہ نے فرمایا: بے شک میں تم پر خوان اُتار دوں گا، پھر تم میں سے جو شخص اس کے بعد بھی کفر کرے گا، تو اس کو میں ایسا عذاب دوں گا کہ دنیا میں کسی کو بھی ایسا عذاب نہ دوں۔

یعنی یہ معاملہ امت کے لیے امتحان تھا، اور اگر ناشکری کی گئی تو سخت ترین عذاب کی وعید دی گئی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''عید'' اللہ کی طرف سے مشروع شریعت نہیں تھی، بلکہ ایک دعا تھی جسے قبول کیا گیا بطور امتحان۔

جبکہ ہمارے دین میں ''عید میلاد'' کو نہ اللہ نے مشروع کیا ہے، نہ رسول اللہ ﷺ نے، نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے۔ رسول اللہ ﷺ کی ولادت کی تاریخ معلوم ہونے کے باوجود آپ نے اسے عید نہیں بنایا۔ تو کیا بات ہے جس کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عید نہیں بنایا اور ہم بنائیں۔

اگر قرآن کی اس آیت سے عید میلاد منانے کا ثبوت ہوتا ہے تو کیا رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی آیت پر عمل نہیں کیا جب کہ آپ کی بعثت کا مقصد ہی قرآن پر عمل کر کے بتانا تھا۔

تو آپ کیا کہیں گے آپ ﷺ ''بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ'' میں ناکام ہو گئے، آپ کیا کہیں گے کہ آپ نے ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ'' کہہ کر لوگوں کو جھوٹا گواہ بنایا؟؟؟!! اَلْعِيَاذُ بِاللّٰهِ! اَلْأَمَانُ وَالْحَفِيظُ!

محرم کے مہینے میں کی گئی ایک بریلوی مفتی کی تقریر کا تجزیہ

آج محرم کا ایک وعظ سننے کا اتفاق ہوا، اسٹیج کی زینت ایک بریلوی مفتی تھے، جوش تقریر میں کرسی سے ایک بالشت اونچے ہو ہو کر سیرتِ عثمان رضی اللہ عنہ پیش کر رہے تھے، ہاتھ لہرا لہرا سامعین کو نائمین نہ ہونے دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

اپنی مشغولی کی وجہ سے پوری تقریر سن تو نہ سکا البتہ چند باتیں بڑی کمال کی تھیں: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سخاوت کا واقعہ بیان کرنے کے بعد استشہاد کے طور پر فرمایا: وَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی۔ جس نے دیا اور وہ اللہ سے ڈرا۔

بھائیوں غور کریں کیا فرمایا "اَعْطٰی" اس کے عموم میں سب داخل ہوگیا، کوئی گیارہویں کی نیاز کرے، کوئی بارہویں کے جلسہ میں کھلائے، کوئی محرم کا کھچڑا کھلائے سب اس میں داخل ہے۔ اور اور اور میں کہوں آپ سے جو "اَعْطٰی" پر عمل کرتا ہے وہ "وَاتَّقٰی" ہوجاتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذو النورین وجہِ لقب بیان کرنے کے بعد فرمایا: بھائیوں پوچھو ان لوگوں سے جو عثمان کو تو ذو النورین کہتے ہیں لیکن آقا کو نور نہیں مانتے، ارے عثمان جب ذو النورین ہوئے تو آقا تو نور علی نور ہوئے۔ (سبحان اللہ کی آوازیں)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ سب سے پہلے حساب کس کا ہوگا تو فرمایا ابو بکر کا۔ دریافت فرمایا ثُمَّ مَنْ (پھر کس کا)؟ فرمایا: عمر کا۔ دریافت فرمایا: ثُمَّ مَنْ؟ فرمایا: ثُمَّ أَنْتَ. حضرت علی رضی اللہ عنہ حیرت زدہ، تیسرا نمبر تو عثمان کا تھا (مقرر آواز حلق تک پہنچ کر کھر کھرانے لگی) یارسول اللہ یہ کیا ماجرا ہے؟

آقا نے فرمایا: اے علی! عثمان باحیا تھے (اور کچھ اوصاف گنوائے) میں نے کہا اے اللہ تو نوح کا حساب لے لینا موسیٰ عیسیٰ کا لے لینا، میرا حساب لے لینا، عثمان کا نہ لینا۔ (حوالہ کسی کتاب کا نہیں دے رہے تھے) دوستو! عثمان وہ صحابی ہیں جو بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے۔

ایک مرتبہ حضرت عثمان نے آقا کی دعوت کی۔ بڑی کمال کی بات یاد آئی ہے غور سے سنو، جب آقا دعوت میں شریک ہونے کے لیے گھر سے نکلے تو وہ قدم شمار کرنے لگے اور ہر ہر قدم کے عوض ایک غلام آزاد کیا (مقرر صاحب کے ہاتھ کے اشارے سے سبحان اللہ کی آوازیں گونجنے لگیں۔)

جلسہ کی نظم میں میں نے یہ سنا نبی مختار کل ہیں وہ عطا کرتے ہیں، ان کی دعاؤں میں یہ بھی سنا اے اللہ عطا کیجیے رسول اللہ کے واسطے، یا رسول اللہ عطا کیجیے خدا کے واسطے۔

بریلوی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم؟استاذ شاگرد کے دو طرح کے فتوی

(۱) الجواب: اگر یقین کے ساتھ اس بات کا علم ہو کہ امام کے عقائد کافرانہ اور مشرکانہ ہیں وہ بدعقیدہ ہے تو ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں اور اگر یقین کے ساتھ اس بات کا علم نہ ہو تو پھر اگر دوسری مسجد بہت دور ہو اور وہاں پنج وقتہ حاضری دینا مشکل ہو تو مجبوراً ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ لے، تنہا پڑھنے سے ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا بہتر ہے کہ جماعت کی بہت اہمیت ہے۔ (فتاوی رحیمیہ ۳/۴۰)

(۲) الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آج کل کے فرقہ مبتدعہ کے عقائد حد شرک تک پہنچے ہوئے ہیں، اس لیے ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، البتہ اگر کوئی بدعتی شرکیہ عقائد نہ رکھتا ہو؛ بلکہ موحد ہو، صرف تیجہ، چالیسواں وغیرہ جیسی بدعات میں مبتلا ہو، اس کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔ (محمود الفتاوی ۲/۴۴۵)

بعد کے فتووں میں یہ بدلاؤ کیوں آیا؟

کچھ باتیں تو آپ نے سابق تحریر میں پڑھ لیں، مزید ملاحظہ فرمائیں: اس مرتبہ کام کی جگہ سے متصل ان کے وعظ کا پنڈال ہے، اس وجہ سے تقریرات سے مستفید ہونے کا خوب موقع فراہم ہوا۔

دس دن تک ایک ہی مفتی صاحب آ کر تقریر فرماتے ہیں، مفتی صاحب کا انداز بیان بریلویانہ ہی ہے، کسی بھی بات پر آواز چیخنے کے سبب حلق میں پہنچ کر کھرکھرانے لگتی ہے، بالخصوص جب کوئی واقعہ یا حدیث نقل کر کے ''کیا مطلب'' کہتے ہیں۔ لام کے بعد آواز مد منفصل کے بقدر ہلکے امالہ کے انداز میں دراز کرتے ہیں: ''کیا مطلب'' تقریر کے دوران پنڈال، کھیچڑا، شربت، نیاز کا انتظام کرنے والے سیٹھ کا نام ضرور لیا جاتا ہے! کیا مطلب؟

دوران بیان یہ نعرے لگائے جاتے ہیں:

نعرۂ تکبیر: اللہ اکبر

نعرۂ رسالت: یارسول اللہ

مسلک اعلی حضرت: زندہ باد

جشن شہداء کربلا: ۔۔۔۔۔۔۔

جلسہ کی شروعات کچھ اس طرح کے اشعار سے ہوئی:

امت کی مغفرت کو طلب کیا جس نے مہر میں
فاطمۃ الزہراء ہیں وہ کوئی اور نہیں ہے
سورج بھی نہیں نکلتا اجازت لیے بغیر
بغداد کے راجا ہیں کوئی اور نہیں ہے
پتھر پر دریا پر ہے جس کی حکومت
اجمیر کا راجہ ہے کوئی اور نہیں ہے
اسلام باقی ہے شریعت میں جان باقی ہے
ہوتا ہے ذکر حسین یہاں اس لیے ہندوستان باقی ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت بیان کرتے ہوئے فرمایا: مشکل کشا کہلاتا ہے مولا علی، قوتِ پروردگار جنھیں کہا جاتا ہے وہ علی۔

فرمایا: شیر اگر کچھار میں ہو تو وہ اسد ہے، اگر کھڑا ہو تو غضنفر ہے چلے تو ذرعام ہے لپکے تو عباس ہے جھپٹے تو حمزہ ہے گردن توڑے تو حیدر ہے اور بار بار توڑے تو کرار ہے (''ہے'' میں کھر کھرانے کی آواز حلق میں)

فرمایا: دعوت عشیرہ ہوئی جب وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ نازل ہوئی صفا پر چڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دعوت دی ہے، کوئی کھڑا نہیں ہو رہا ہے دس سالہ علی کھڑے ہوئے اے اللہ کے رسول میں ہوں آپ کے ساتھ، آپ نے بٹھا دیا پھر کوئی کھڑا نہیں ہوا، علی نے کہا! میں ہوں نا آپ کے ساتھ، پھر تیسری مرتبہ ایسا ہوا، پھر علی کھڑے ہوئے اور کہا: اے اللہ کے رسوول! میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ (روایت کا کوئی حوالہ نہیں)

وہ جو آپ نے ساتھ ہونے کی بات کہی تھی پھر وہ آپ نے زندگی بھر نبھائی۔

میدان بدر ہے، جنگ زوروں پر، آپ کا کوئی ہم شکل شہید کر دیا جاتا ہے، مشہور ہوگیا کہ رسول اللہ شہید کر دیے گئے، علی حیران ہیں، ایسی زندگی کس کام کی، وہ کافروں کے جھنڈ میں گھس گئے ہیں، کشتوں کے پشتے لگا رہے ہیں، کاٹ کاٹ کر کافروں کی چھٹائی کر رہے ہیں پھر کیا دیکھتے ہیں سامنے آقا جلوہ افروز ہیں، حضور جلوہ نما ہیں۔ (نارے)

علی مولا بہت تیز رفتار تھے، کچھ لوگ آپ کی کھجوریں اور اونٹنیاں لے کر بھاگے ہیں، آپ

کو اطلاع ہوتی ہے ،آپ پیچھا کرتے ہیں، آپ ان کو پالیتے ہیں، ایک کی گردن پر پیر رکھا اس کو مسل دیا دوسرے کی گردن پر پیر رکھا اس کو مسل دیا۔

آپ عالم الغیب ہیں ایک غزوہ کے حالات بیان کر رہے ہیں۔

مولا علی کے گھر میں فاقہ ہے صرف چھ درہم ہیں کوئی اللہ کے نام پر آواز لگاتا ہے مولا علی ہیں دل سے سخی ہیں وہ رقم ان کو دیتے ہیں ،ارے یہ کیا چھ درہم تھے وہ بھی صدقہ کر دیے ،لیکن اللہ کے یہاں تو ایک کے دس ہیں ،علی نکلتے ہیں دیکھتے ہیں کوئی گھوڑا بیچ رہا ہے مولا علی کہتے ہیں مجھے ادھار بیچو گے؟ انھوں کہا ۱۰۰ر درہم میں بیچوں گا، علی خرید کر لے کر چلتے ہیں راستے میں ایک شخص ملتے ہیں، کہتے ہیں علی بیچو گے کیا؟ معاملہ ایک سو ساٹھ درہم میں طے ہوا، مولا علی نے ان پیسوں میں سے سو درہم پہلے شخص کو دیتے ہیں، کیا مطلاااب؟... چھ کا چھ سو، آقا ﷺ نے فرمایا علی پہلے شخص جبریل اور دوسرے اسرافیل تھے۔

مقرر نے کہا ''رُكَّعًا سُجَّدًا'' سے مولا علی کی ذات مراد ہے۔اہل بیت اطہار کی محبت سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔

یہ جو مجلس سجائی ہے اہل بیت کی محبت میں ،اس سجانے والے کی محبت تو دیکھیے۔ (مراد سیٹھ صاحب ہیں) جو ان کی اس مجلس میں آئے وہ حسینی ہیں وہ سب جنتی ہیں۔محبت میں فضول خرچی نہیں ہوتی محبت میں جو بوو گے وہ پاؤ گے۔

آپ ﷺ نے فرمایا جس نے سب سے زیادہ مجھ سے اور اہل بیت سے محبت نہ کی وہ مومن نہیں۔

آپ نے فرمایا اہل بیت اطہار کشتی نوح ہے اور صحابہ ستارے ہیں۔کیا مطلب، کشتی میں بیٹھنا ہے ورنہ ڈوب جاؤ گے اور ستاروں سے راستہ معلوم کرنا ہے ورنہ کھو جاؤ گے۔

جو کشتی میں نہیں بیٹھا وہ خارجی ہو گیا اور جس نے ستاروں سے راستہ نہیں لیا وہ رافضی ہو گیا اور جو کشتی میں بھی بیٹھا راستہ ستاروں سے بھی لیا وہ سنی ہو گیا۔

فرمایا: حسن نام کسی نے نہیں رکھا سب سے پہلے حسن بن علی کا رکھا گیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ نام مخفی رکھا تھا کہ میرا بچہ آئے گا اس کا یہ نام رکھا جائے گا۔

فرمایا: نظم میں آپ لوگ جھومتے نہیں ہو داد نہیں دیتے ہو۔حضرت حسانؓ جب نعت پڑھتے

تھے تو حضور ﷺ جھوم جاتے تھے۔ یہ سنت ہے۔

(محترم قارئین بیانات میں رطب و یابس کا طومار، بے سند باتیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حق میں غلو کا آپ مشاہدہ کر رہے ہوں گے۔

یہ گروہ (فرقۂ بریلوی) جو اہل سنت و الجماعت سے علاحدہ ہوا اس کی اہم وجہ یہی ہے یعنی انبیاء، صحابہ اور اولیاء کے حق میں غلو۔ ان کو ان کی حد سے بڑھا دینا۔ چنانچہ وہ نبی کریم ﷺ کو عالم الغیب، حاضر ناظر اور نور مانتے ہیں، حضرت علی کو مشکل کشا مانتے ہیں، اور اولیاء کا بھی درجہ ان کی حد سے بڑھا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے دیوبندیوں کو چاہیے کہ وہ مقدس ہستیوں کے بارے میں غلو سے بچیں، من گھڑت روایتیں بیان نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ کریں۔)

———

کیا نبی کریم ﷺ عالم الغیب ہیں؟

ایک اور بیان کا تجزیہ اور سوال کا جواب:

آج مجلس وعظ کا آخری دن ہے۔۔موصوف آج بہت پر جوش ہیں۔۔۔کرسی پر قرار نہیں ہے۔۔۔ ہاتھ مائیک سے آگے کو ہو ہو جارہے ہیں ۔۔۔۔ کہہ رہے ہیں آج تو نچوڑ کا دن ہے۔۔۔ اہل سنت والجماعت کی پہچان آج بتارہے ہیں۔۔۔فرماتے ہیں: اہل سنت والجماعت کون ہیں؟ صحابہ نے پوچھا اے اللہ کے رسول جنتی کون ہوگا؟ آنے والے دنوں میں کئی فرقے ہوں گے سب یہی کہیں گے ہم جنتی ہیں، خارجی کہیں گے ہم جنتی ہیں ۔۔۔۔رافضی کہیں گے ہم جنتی ہیں۔۔۔ وہابی کہیں گے ہم جنتی ہیں ۔۔۔۔ جو امام والے نہیں ہیں وہ بھی کہیں گے ہم جنتی ہیں۔۔۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي''

جو صحابہ کے عقائد پر ہوگا وہ جنتی ہوگا۔

صحابہ کا عقیدہ کیا تھا!!!!؟

صحابہ آقا کو عالم الغیب جانتے تھے۔

صحابہ یقین رکھتے تھے کہ آپ ظاہر کو بھی جانتے ہیں باطن کو بھی جانتے ہیں۔

آگے بھی دیکھتے ہیں پیچھے بھی دیکھتے ہیں۔

آگے مقرر کہتے ہیں: میں ایک حدیث پیش کروں گا، آقا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا گزر دو قبروں سے ہوا۔۔۔آقا نے فرمایا: ان دونوں قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے۔۔۔ آقا بھی ان دو قبروں کو دیکھ رہے ہیں۔۔۔صحابہ بھی دیکھ رہے ہیں۔۔۔آقا اپنے حساب سے دیکھ رہے ہیں۔۔۔صحابہ اپنے حساب سے ۔۔۔۔آقا نے فرمایا: اس قبر والے کو پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے ۔۔۔۔ اور دوسری قبر والے کو۔۔۔۔ کہ وہ چغلیاں کیا کرتا تھا۔

صحابہ نے آقا کی بات پر اعتراض نہیں کیا۔۔۔ اس پر یقین کیا۔معلوم ہوا صحابہ بھی نبی کریم ﷺ کو عالم الغیب مانتے تھے۔

جواب: اس استدلال کا جواب بالکل واضح ہے، رسول اللہ ﷺ کو انباء الغیب کا تو علم تھا لیکن آپ عالم الغیب نہیں تھے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنی غیب کی خبریں آپ کو عطا کی وہ آپ

جانتے تھے یقیناً آپ کو اولین و الآخرین میں سب سے زیادہ علم دیا گیا تھا لیکن آپ عالم الغیب نہیں تھے کہ بغیر واسطہ کے تمام اصول غیب پر آپ مطلع ہوں۔

تمام محدثین متفق ہیں کہ حدیث جبریل آپ کی زندگی کے آخری ایام کا واقعہ ہے، اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے قیامت کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا: ''مَا الْمَسْؤُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ'' یعنی قیامت کے بارے میں جس سے پوچھا جارہا ہے وہ سائل نے زیادہ نہیں جانتا یعنی عدم علم میں دونوں برابر ہیں۔

اگرچہ بعض بریلوی عالم نے یہ کہا ہے کہ یہاں تسویہ عدم علم میں نہیں بلکہ علم میں ہے یعنی جس طرح تم جانتے ہو قیامت کے بارے میں اسی طرح میں بھی جانتا ہوں، (لیکن لوگوں میں بتانا مناسب نہیں ہے)

لیکن دوسرے بریلوی علماء ہی نے اس کو نکار دیا ہے، کیوں قیامت کے وقوع کا علم صرف اللہ تعالی کو ہے یہ قرآن میں بھی ہے اور حدیث جبریل کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جبریل کے جبریل ہونے کا علم ان کے جانے کے بعد ہوا۔

بہر حال حدیث جبریل اور بعض دیگر نصوص کی وجہ خود مولانا غلام احمد رضا صاحب اور دوسرے علمائے بریلوی نے یہ کہا ہے کہ حضور ﷺ کو علم غیب ان کے مرنے سے کچھ ساعات پہلے دیا گیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے، آج تک اس پر ثبوت ندارد ہیں۔

پھر انھوں نے یہ دیکھا کہ اگر حضور ﷺ کو عالم الغیب کہیں تو اللہ تعالیٰ بھی عالم الغیب ہیں۔ اس سے تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی کو شریک کرنا لازم آرہا ہے تو یہ تاویل کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کا علمِ غیب ذاتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا عطائی۔ یعنی اللہ کا عطا کردہ۔

اس تاویل کی وجہ سے ان کو شرک کرنے والا نہیں کہا جاتا۔

تعلیم وتعلم کے ساتھ تجارت مفید یا مضر

تعلیم کے ساتھ تجارت؛ایک خوش نُما نعرہ: آج کل ایک نعرہ بہت زور وشور کے ساتھ لگایا جاتا ہے کہ علماء تعلیم وتعلم کے ساتھ تجارت کا مشغلہ بھی اختیار کریں، بہ ظاہر یہ بہت سنہرا اور خوش نما نعرہ ہے؛ لیکن درحقیقت یہ ایک زہر آلود نعرہ ہے، تعلیم وتعلم کا بستر سمیٹنے والا نعرہ ہے؛ کیوں کہ تجربے سے یہ بات ثابت ہے کہ جو لوگ تعلیم وتعلم کے ساتھ تجارت کا مشغلہ اختیار کرتے ہیں ان کے اندر دو باتوں میں سے کوئی ایک ضرور پائی جاتی ہے:(۱) یا تو ایسے لوگ تعلیم ہی ترک کر دیتے ہیں،اکثر وبیشتر تو یہی ہے۔ (۲) یاان کا علم سطحی رہ جاتا ہے، تحقیقی نہیں رہتا۔

اکثر وبیشتر مذکورہ دونوں باتوں میں سے کوئی ایک ضرور پائی جاتی ہے، تجربے سے یہ بات ثابت ہے، تجربہ بھی کسی چیز کا نام ہے، ہاں اتفاق اور نوادر تو ہر جگہ ہو سکتے ہیں، ہر کوئی امام ابوحنیفہ نہیں ہوسکتا، علماء اگر تجارت میں لگیں گے تو پھر تجارت ہی کے ہو کر رہ جائیں گے، تعلیم وتعلم کے لیے سو فی صد یک سوئی ضروری ہے۔

(استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری – حفظہ اللہ ورعاہ – دوران درس "رسم المفتی" ۱۱/ربیع الثانی ۱۴۴۷ھ ساعتِ سوم بہ روز سنیچر)

تبصرہ یکے از فاضل: استاذ محترم حضرت مفتی صاحب کے ارشادات یقیناً خیر خواہی پر مبنی ہیں، ان کی بات میں وزن بھی ہے کہ تعلیم وتعلم کے لیے یکسوئی ضروری ہے۔ البتہ موجودہ حالات کے تناظر میں چند گزارشات قابلِ توجہ ہیں:

آج کے دور میں اکثر مدارس ومکاتب کے اساتذہ کی تنخواہیں انتہائی قلیل ہیں، بمشکل گھر کا خرچ، بچوں کی تعلیم، علاج یا کرایہ پورا ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی عالم یا معلم اپنی عزتِ نفس کو قائم رکھتے ہوئے وقت کے تقاضے کے مطابق حلال تجارت یا محنت کا ذریعہ اختیار کرے، تو یہ نہ صرف جائز بلکہ باعثِ عزت و وقار ہے۔

یہ کہنا کہ "جو تجارت کرے گا، تعلیم چھوڑ دے گا" یا "اس کا علم سطحی ہو جائے گا" یہ عمومی قاعدہ نہیں، بلکہ بعض افراد کے تجربات پر مبنی بات ہے۔ ہر شخص ایسا نہیں ہوتا۔ جیسے ہر تجارت کرنے والا علم سے غافل نہیں ہوتا، ویسے ہی ہر مدرس تنخواہ پر قناعت کر کے بھی علم کا حق ادا نہیں کر پاتا۔ اصل چیز نیت اور ترجیح ہے۔ اگر عالم علم کو اصل اور تجارت کو وسیلہ

رکھے تو کوئی قباحت نہیں۔خود نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اور بہت سے اکابر ائمہ (جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ) تجارت کرتے تھے، لیکن ان کا علم وفضل کم نہیں ہوا بلکہ بڑھا۔

حضرت کا یہ فرمان بجا ہے کہ "ہر شخص امام ابوحنیفہ نہیں ہوسکتا"، لیکن ہر شخص تجارت میں لگ کر علم چھوڑ دے گا، یہ کہنا درست نہیں۔اگر ماحول، نیت اور ترتیب درست ہو تو علم وتجارت دونوں جمع ہوسکتے ہیں۔

اسلام نے ہمیں ہاتھ پھیلانے کے بجائے محنت اور خودکفالت کی تعلیم دی ہے۔

نبی ﷺ نے فرمایا: "اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلَى" (اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے) (بخاری ومسلم)

لہٰذا مناسب بات یہ ہے کہ ہم علماء کو تجارت سے روکنے کے بجائے یہ نصیحت کریں کہ: علم کو اصل رکھو، تجارت کو ذریعہ بناؤ، اور نیت کو خالص رکھو۔تاکہ علم بھی باقی رہے اور عزتِ نفس بھی۔

ایک طالبِ علم کا مخلصانہ تبصرہ

گزارشات از من بندۂ ناتواں:

تعلیم وتعلم مع شغل بالتجارۃ:

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ فارغ ہونے والے ذہین طلباء کو کہا کرتے تھے کہ فارغ ہونے کے بعد اگر دس سال تک پڑھاؤ گے تو علم سے مناسبت پیدا ہوگی اور پندرہ سال تک پڑھاتے رہو گے تو کچھ علم آئے گا۔

حضرت مولانا اسماعیل صاحب چاسوی دامت برکاتہم (استاذ حدیث جامعہ ڈابھیل) سے مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنا تھا کہ جو طالب علم بعد از فراغت پڑھاتا ہے اس کا علم معتبر ہوتا ہے اور اسی قدر جتنا وہ پڑھاتا ہے۔

ان دونوں باتوں میں اگرچہ تجارت کا ذکر نہیں ہے لیکن یکسوئی مفہوم ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ مشہور ہے: کہ عالم کو یکسوئی چاہیے چاہے اس کے پاس ایک سوئی نہ ہو۔

جامعہ کے اجلاس صد سالہ میں فاضلان جامعہ سے اساتذہ کی دلسوز نصیحتوں میں سے ایک یہ

تھی کہ ہمارے فاضل علم میں رسوخ پیدا کریں جو نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ فی زمانناسطحی اور سرسری علم نا کافی ہے۔جس کی بہت سخت ضرورت ہے۔

بات درحقیقت ایسی ہے:اِلا شْتِغَالُ بِالشَّیْءِ یَسْتَلْزِمُ الاِ شْتِغَالَ عَنْ آخَرَ. یعنی ایک چیز میں مشغولی دوسری چیز سے اعراض ہے۔

یہ بات بالکل بدیہی ہے ، اس کا انکار بداہت کا انکار ہے۔

صدق نیت سے تجارت اگرچہ دنیا نہیں ہے مگر امور دنیا میں سے ضرور ہے ۔

کسی دانا کا کہنا ہے۔ مَنْ طَلَبَ الآخِرَةَ أَضَرَّ بِالدُّنْیَا، وَمَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا أَضَرَّ بِالآخِرَةِ. یعنی جس نے آخرت طلب کی دنیا کا نقصان اٹھایا اور جو طالبِ دنیا ہوا آخرت کو گھاٹے میں ڈالے گا۔

اگرچہ ''من'' کو خاص کر سکتے ہیں اور ''طلب'' کو طلب تام پر محمول کر سکتے ہیں۔اس کے باوجود بھی قاعدہ کلیہ نہیں تو اکثریہ ضرور ہے۔

اپنے کسی استاذ سے غالبا حضرت مولانا مفتی حفظ الرحمن صاحب (استاذ تفسیر و حدیث و قاضی جامعہ ڈابھیل) سے سنا تھا کہ ''مولویانہ / عالمانہ مزاج بنانے کی اور باقی رکھنے کی ضرورت ہے'' اور یہ خالص علمی مشغولیت سے حاصل ہوگا، اگر کوئی شخص کالج ، (مروجہ تبلیغ) ،تجارت میں مشغول ہوگیا تو اس مزاج کا بقا مشکل ہے۔ کما شہدت بہ المشاہدۃ۔

خود بندے کا حال یہ ہے کہ یہ ناموزوں وغیر متوازن تحریر بھی دکان پر بیٹھ کر لکھ رہا ہے۔ نہ یکسوئی ہے کہ قلبی سکون۔جس وقت صرف اور صرف تدریس مشغلہ تھا یہ وقت بھی مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔اس وقت پڑھانے کا عجب لطف ہوتا تھا۔اگرچہ بندے پر ہر مشغول بالتجارت کو قیاس کرنا ناانصافی ہے۔لیکن انصاف کی بات یہی ہے کہ دو ناؤ میں ایک ساتھ سوار ہونا دشوار ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب سریر ائے خلافت ہوئے تو بقول عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے انھوں نے یہ کہتے ہوئے تجارت کو خیر باد کہہ دیا:

''میرے قوم کے لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ میرا پیشہ (کاروبار) میرے اہل وعیال کے خرچ کے لیے کافی تھا، لیکن اب میں مسلمانوں کے امور میں مشغول ہوگیا ہوں، اس لیے اب ابو بکر کا گھرانہ اسی (بیت المال) سے کھائے گا، اور میں مسلمانوں کے لیے اس میں کام کروں گا۔'' (بخاری)

جن اکابر کی ہم مثال پڑھتے ہیں کہ وہ تجارت بھی کیا کرتے تھے اگر کوئی ان حضرات کی طرح تجارت کرے تو کیا خوب بات ہے۔

تاریخ علم فقہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دن رات کی مشغولیت پیش خدمت ہے:

''امام ابو حنیفہ کے شبانہ روز کے معمولات عموماً یہ تھے کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے، دور سے استفتے آئے ہوئے ہوتے ان کے جواب لکھتے، پھر تدوین فقہ کی مجلس منعقد ہوتی، بڑے بڑے نامور شاگردوں کا مجمع ہوتا، گفتگو شروع ہوتی، مسائل کے جواب، بحث مباحثہ کے بعد قلمبند کر لیے جاتے، نماز ظہر پڑھ کر امام صاحب گھر آتے گرمیوں میں ہمیشہ نماز ظہر کے بعد سو رہتے، نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک درس وتعلیم کا مشغلہ رہتا باقی وقت لوگوں سے ملنے ملانے، بیماروں کی عیادت، ماتم پرسی اور غریبوں کی خبر گیری میں صرف ہوتا۔''

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی شبانہ روز کی مشغولیت میں تجارت کا حصہ کہاں ہے؟ درحقیقت یہ تاجر تو تھے لیکن مشغول بالتجارت نہیں تھے۔

زندہ مثالوں میں بندہ حضرت مفتی ابو بکر صاحب پٹنی مدظلہ (استاذ جامعہ ڈابھیل) کی مثال پیش کرنے کا حق رکھتا ہے کہ آپ کتب فروش ہیں، صاحب مکتبہ ہیں لیکن کچھ اس طرح معاملہ سیٹ کیا ہے کہ عملِ تجارت آپ کے وقت کو کھاتا نہیں ہے۔

یقیناً یہ بات ہے کہ علماء اور خدام الدین کی تنخواہیں تن خواہی کے لیے ناکافی ہیں۔ لیکن یہ بات کوئی نئی نہیں ہے۔ تجارت میں مشغول ہونے سے بہتر یہ ہے کہ علماء کی تنخواہیں بڑھانے کی وسیع وہمہ گیر کد وکاوش کی جائے، ممکن ہے ضیق دنیا کا عذر ختم ہوجائے۔

اس کا ایک حل وہ ہے جو حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری کے سبق باب کسب الرجل وعمله بيده میں فرمایا تھا کہ :اسلام نے اپنے ہاتھ سے کر کے کمانے کی ترغیب دی اور ہاتھ پھیلانے کو "موجب خدوش (زخم) فی وجهه" قرار دیا ہے جب کہ بلا ضرورت ہو۔

جب میں (شیخ پالنپوری) پڑھنے کے بعد پڑھانے بیٹھا تو ہر ماہ ۲۵/ تاریخ کے بعد حالت یہ ہوتی کہ گھر میں چائے بند اور پان بند۔ تنخواہ ہی ختم ہوجاتی تھی، میں گجراتی تھا، تجارت ہماری گھٹی میں پڑی تھی کوئی اور تجارت کرسکتا تھا لیکن میں نے مناسب یہ سمجھا کہ ایسا مشغلہ اختیار کیا جائے

کہ تدریس میں خلل نہ آئے بلکہ تدریس کے لیے معاون ہو۔

لہٰذا میں نے تصنیف کا کام شروع کیا کہ کتاب لکھی جائے اور فروخت کی جائے، اور آج الحمد للہ حال یہ ہے کہ میرے پورے عیال کے اخراجات اس کتب خانے سے پورے ہوتے ہیں، دار العلوم سے تنخواہ نہیں لیتا ہوں اور جو یہاں سے لی ہے اسی طرح مدرسہ راندیر سے جو لی تھی وہ سب اسی کتب خانے سے لوٹا چکا ہوں۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایسے اسباب و استطاعت ہر ایک کو میسر نہیں ہے لہٰذا کوئی شخص عزت نفس اور دستِ سوال کے درازی سے حفاظت کے پیش نظر تدریس کے ساتھ کوئی تجارتی مشغلہ اختیار کرتا ہے تو یہ دینداری تو ہے۔ لیکن یہ کہنا کہیں تک درست نہیں کہ اس سے تدریسی خدمات متاثر نہیں ہوتیں یا کم متاثر ہوتی ہیں۔

———————

کیا مروجہ تبلیغی کام فرض عین ہے؟

سوال: ایک صاحب نے ایک اوڈیو بھیجا جس میں یہ کہا گیا کہ مروجہ تبلیغی عمل فرض عین ہے۔جس طرح نکاح کو حدیث شریف میں سنت کہا گیا ہے لیکن یہ فرض ہے۔ اسی طرح مروجہ تبلیغی عمل بھی سنت سے ثابت شدہ فرض عین ہے۔

جواب: مذکورہ اوڈیو میں جو مثال پیش کر کے مروجہ تبلیغی جماعت میں جانا فرض عین کہا گیا ہے وہ غلط ہے اور مبنی بر جہالت ہے اور قیاس مع الفارق ہے۔

حدیث شریف میں یہ جو کہا گیا کہ ''اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي'' یہاں سنت سے مراد اصطلاحی سنت نہیں بلکہ سنت سے اس کا لغوی معنی مراد ہے یعنی نکاح میرا طریقہ ہے اور آپ کا طریقہ فرض بھی ہوسکتا ہے اور غیر فرض بھی۔

اور نکاح کا حکم پہلے ہی سے فرض کا ہے ان نوجوانوں کے لیے جو نکاح کی استطاعت رکھتے ہیں اور اپنے اوپر عَنَت (زنا) کا خوف رکھتے ہیں۔ اسی وجہ حضور ﷺ نے فرمایا ''يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ، مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ'' یعنی اے نوجوانوں کی جماعت تم میں سے جو نکاح کی وسعت رکھتا ہے تو چاہیے کہ وہ نکاح کرلے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حفاظت فرج کے لیے نکاح متعین ہے کیوں کہ اب ''تَسَرِّی'' (باندی رکھنا) نہیں ہے اور کسی فرض تک پہنچنے کا ذریعہ ایک ہو تو وہ ذریعہ بھی فرض ہوجاتا ہے۔ جب کہ تبلیغ دین کے کئی ذرائع ہیں، مروجہ تبلیغ کے ماسوا۔

تیسری بات یہ ہے کہ تبلیغ دین یہ اپنے اندر ایمانی حرارت کو پیدا کرنے کی محنت ہے، اسی وجہ سے حضرت جی مولانا الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر میں اس جماعت کو کوئی نام دیتا تو میں تحریک ایمان نام دیتا نہ کہ تبلیغی جماعت۔ لہٰذا تبلیغی جماعت کے وہ کام نہیں ہے جن کا حوالہ دے کر اس کو فرض عین کہا گیا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ ضرورت اور حالات کے بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے یہ ایک ایسا اصول ہے جس کی لاٹھی ہر کس نہیں چلا سکتا، سابق مفتی اعظم پاکستان مفتی عبد الرشید صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ احسن الفتاوی میں رقم طراز ہیں کہ ضرورت و حالات کی وجہ سے حکم کا بدلنا یہ ایک ایسا اصول ہے جس کے بارے میں ایک عام مفتی بھی لب کشائی ہر گز نہیں کرسکتا، اس کا فیصلہ ایک ماہر فقیہ

کرسکتا جس کو علوم پر مہارت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ زمانہ وعرف سے بھی پوری طرح باخبر ہو۔ اور ایک زمانہ سے وہ فقہ و فتاوی سے مزاولت رکھتا ہو۔

پانچویں بات یہ کہ یہ مثالیں پیش کرنا اس وقت اور غلط ہوجاتا ہے جب کہ مفتیان کرام کی بلکہ ان مفتیان کرام کی تصریحات موجود ہیں جو تبلیغی جماعت سے عملا وابسطہ ہیں کہ ''جماعت میں جانا فرض عین نہیں ہے بلکہ صرف مستحب یا جائز ہے۔''

(اگر کوئی اس کو فرض عین سمجھتا ہے تو وہ بدعتی ہے اور یہ گمان رکھتا ہے کہ دین کی اشاعت و حفاظت اور ارتداد کی روک تھام کا واحد یہی ایک ذریعہ ہے)

چھٹی بات یہ ہے کہ فرض عین کہنے کی کوئی ایسی نص کا ہونا ضروری ہے جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہو اور یہاں تو ایسی کوئی نص موجود نہیں ہے بلکہ نبی کریم ﷺ نے مروجہ تبلیغ کے انداز میں کبھی ایک بار بھی محنت دین نہیں کی۔

ساتویں بات یہ ہے کہ اگر فرض عین کہا جائے تو پھر کہنے والے کے نزدیک ہر وہ شخص جو جماعت میں عملا نہیں جارہا ہے تارک فرض ہوگا اور جو اعتقادا جماعت میں جانے کے فرض ہونے کا منکر ہوگا وہ کافر ہوگا۔تو کس کس کو کافر اور کس کس کو فاسق کہا جائے گا؟

کیا مسلمانوں میں بھی ہندوؤں کی طرح چھوت چھات اور ذات پات کی حد بندی ہے؟

سوال: ایک نیوز اینکر نے اسلام اور مسلمانوں کی طرف جھوٹی نسبت کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جس طرح ہندوؤں میں چھوت چھات اور ذات پات کا تصور ہے، اسلام میں بھی (العیاذ باللہ) یہ کانسیپٹ پایا جاتا ہے۔ اور پھر مبنی بر جہالت معلومات سے اپنی بات کو مدلل کرکے عام لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ کہا کہ اسلام میں اشراف، اجلاف، ارذل اور پس ماندہ ذاتیں ہوتی ہیں۔

حال یہ کہ اسلام کا دامن اس طرح کی باتوں اور غلاظتوں سے پاک ہے۔ اسلام نے ذات پات کی بیخ کنی کی ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

جواب: یہ بات کہیں سے کہیں تک بھی صحیح نہیں ہے۔

صرف ایک ہی بات پر اس کی ساری لوجک ڈھیر ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ ذات پات کا تصور ہندوؤں کی اصولی کتابوں میں ہے، ان کے ویدوں، یجروید وں اور ''پرانوں'' میں ہے۔

ذات پات کا نظام ہندوؤں کو برہمن، شتری، ویش اور شودر کے نام سے چار کیٹیگریوں میں تقسیم کرتا ہے۔

اور ہنود اس کو دھرم مانتا تھا، مانتا ہے، اگرچہ سیاسی مفاد کے خاطر وہ ''ہندو ایکتا'' کی دہائی دیتے ہیں، یا مسلمانوں کا ڈر ان کو ایک ہونے پر مجبور کر رہا ہے، اگر ہندوستان میں مسلمان نہ ہوتے تو اعلی ذات کے ہندو نیچ ذات سے جینے کا حق چھین لیتے۔

جب کہ مسلمانوں کی اصولی کتاب قرآن وسنت میں ذات پات کا نام ونشان نہیں ہے، ''إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ'' یعنی تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں جگہ جگہ کہا گیا ہے، کسی کو کسی پر ذرہ برابر فضیلت نہیں، فضیلت تقوی کے لحاظ سے جس کو ہر ایک کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے نومسلم یا آزاد کردہ غلام یا اہل عجم نے دینی قیادت بھی کی ہے اور کبھی خلافت کا انتظام و انصرام بھی کیا ہے، اور عرب وسادات، صدیقی وعلوی نے ان کی اطاعت کی ہے۔ ہاں قبائل ونسبتیں جو انسانوں

میں پہلے سے چلی آرہی تھی وہ اس وجہ سے باقی رکھی کہ ”لتعارفوا“ یعنی تا کہ تم پہچانے جاؤ۔

ویڈیو میں دوسرے نمبر پر جو ذات پات شمار کروایا ہے وہ کسی بھی اسلام کی اصولی کتاب میں نہیں، اور ان کو برصغیر میں ذات ہندوؤں کے اثر کی وجہ سے کہا جانے لگا ورنہ پہلے اور اب بھی برصغیر کے علاوہ اس کو نسبت یا قبیلہ کہتے ہیں تا کہ اس کے ذریعے اس کی پہچان ہو سکے۔

ہندوستان میں نسبت یا قبیلہ کے بجائے ذات کا لفظ چلنے لگا جس سے غلط فہمی ہوگئی کہ یہ ہندوؤں کی طرح ذات ہیں، اور اشراف کا مطلب ہوتا ”معزز لوگ“ اجلاف کا معنی رزیل، کمینہ، نیچ ذات کا شخص اور ارذل کا معنی ذلیل ترین اس طرح کی ذات پات گھڑی ہوئی ہے نہ مسلمانوں میں ہے اور نہ ہی اسلام میں، کسی منافق آدمی نے یہ الفاظ اس کو بتادیے ہوں گے۔

ہاں اسلام میں کفو ہے وہ صرف شادی کے موقع پر ہے باقی کہیں نہیں تا کہ انسان اپنے جیسے لوگ یعنی اپنے قبیلے میں نکاح کرے، کیوں کہ ایک قبیلہ کا رہن سہن ایک جیسا ہوتا ہے، دوسرے قبیلے کے رہن سہن سے کافی مختلف ہوتا ہے، اور یہ اس وجہ ہے کہ نکاح کے مقاصد حاصل ہو سکے اور دونوں میاں بیوی اور دونوں خاندانوں میں آسانی سے موافقت رہ سکے۔

اور پہلے نمبر پر جو ذات پات گنوائی ہے یہ تو بالکل ہی نادانی ہے، ظاہر ہے کہ وہ ذات نہیں بلکہ مکتب فکر ہے جس انگریزی میں School of thought کہتے ہیں۔

ہندوؤں میں کروڑوں خداؤں کو پوجا جاتا ہے کوئی کسی کو پوجتا ہے کوئی کسی کو، مسلمانوں کے ”اللہ اکبر“ کی طرح ان کا نعرہ بھی ایک نہیں ہے کہیں کرشنا کی کہیں رام کی کہیں ہنومان کی کہیں راون کی جے پکاری جاتی ہے، اگر فرقوں کے اعتبار سے ذات مانی جائے تو ہندوؤں کی اکائی تو ہزاروں پر منقسم ہو جائے گی۔

لہٰذا پہلی تقسیم وہ اسلامی نہیں بلکہ نظریات کے اعتبار ہے ہر ایک نے اپنے اعتبار سے دین تک پہنچنے کی راہیں تلاش کی ہیں اور اسی کی طرف منسوب ہوگیا ان میں سے بعض مسلک ہے جیسے حنفی مالکی شافعی اور حنبلی اور بعض مشرب ہے جیسے دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث اور بعض فرقے۔ یہ کوئی ذات نہیں ہے۔

———

مدارس کے نظام ونصاب اور ترتیب پر بے جا تبصرے کا بجا جواب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حفظ قرآن کے بعد کی تعلیم

تبصرہ: بقلم: ڈاکٹر محمد اکرم ندوی

مولانا شفیع الرحمن صاحب ندوی مسقط (عمان) میں مقیم ہیں، انھوں نے استفسار کرتے ہوئے لکھا:

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، میں شفیع الرحمن مسقط (عمان)، بہت ہی ڈرتے ہوئے میں یہ میسیج کر رہا ہوں، آپ کی مشغولیت بہت زیادہ رہتی ہے جب بھی آپ کو ٹائم ملے گا تو جواب دے دیجئے گا، میرا بیٹا حفظ کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ رمضان المبارک میں پورا ہو جائے، عمر اس کی ۱۶/ سال رمضان المبارک تک ہو جائے گی، ہمیں آپ سے یہ جاننا ہے کہ آگے کی تعلیم کس طرح سے دلائی جائے، آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کو صحت وعافیت اور لمبی عمر عطاء فرمائے آمین۔

ج: بہت مبارک ہو کہ آپ کا بچہ حفظ قرآن مکمل کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ اسے مزید علم کی دولت سے نوازے اور اسے دنیا وآخرت میں ترقی دے۔

قرآن شریف کے الفاظ کو زبانی یاد کرنا بہت بابرکت ہے، مگر یہ حفظ قرآن نہیں، قرآن، حدیث اور عربی زبان میں حفظ کا مفہوم وہ نہیں ہے جو آج کل رائج ہے، یہ حفظ کی تقلیل وتصغیر ہے، میں نے حفظ کا مفہوم اپنے عربی اور انگریزی مضامین میں بیان کیا ہے، کسی موقع سے اردو میں بھی اس پر کچھ لکھوں گا، اس وقت آپ کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے گی۔

آپ بچہ کی تعلیم پر غور کرتے ہوئے دینی تعلیم کی طرح دنیوی تعلیم کو بھی اہمیت دیں، دنیوی تعلیم سے معاش کا مضبوط تعلق ہے، اس دنیا کے اندر معاش کی جو اہمیت ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کچھ لوگ جذباتی نعرے لگا کر آپ کو ترغیب دیں گے کہ بچوں کی دینی تعلیم پر توجہ مرکوز کریں تا کہ وہ آئندہ دین کی خدمت کریں، مگر تجربہ شاہد ہے کہ معاش کا مناسب نظم نہ ہونے کی شکل میں مدارس کے فارغین دین کی کوئی قابل قدر خدمت نہیں کر پاتے، بلکہ کتنے علماء کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ٹیکسی ڈرائیونگ اور دوسرے دنیوی کام کرتے ہیں، اور آہستہ آہستہ وہ اپنی دینی تعلیم کو بھول جاتے ہیں۔

آپ جس ملک میں بھی رہتے ہیں وہاں کے نظام کے تحت اپنے بچے کی دنیوی تعلیم کا اہتمام کریں، جس کے بعد اسے کوئی معقول ملازمت ملے اور معاش کی طرف سے کسی حد تک مطمئن ہوجائے۔

ظاہر ہے کہ یہ دنیا کھانے پینے کی جگہ نہیں، بلکہ آخرت کی تیاری کی جگہ ہے، اس لئے اپنے بچے کی دینی تعلیم کا خیال کریں، اس وقت ہندوستانی مدرسوں میں دین کی تعلیم کے نام سے جو کچھ دیا جارہا ہے وہ بہت گھٹیا مال ہے۔

دین کے نام سے مسلک پڑھایا جارہا ہے، چونکہ مسلکوں کی کوئی حد نہیں، اس لئے شروع ہی سے فرقہ بندی کا عقیدہ ذہنوں میں راسخ کردیا جاتا ہے، یعنی مسلمان امت واحدہ نہیں بلکہ فرق متحاربہ ہیں، دین کی بنیاد خدا کی بندگی اور آخرت کی کامیابی کی تیاری پر ہے، جب کہ مسلک کی بنیاد ظاہری شناخت پر ہے، اس لئے مدرسوں سے فارغ ہونے والوں کی پوری توجہ کرتا پائجامہ اور ٹوپی پر ہوتی ہے، ہر مسلک کا لباس جدا ہوتا ہے، اسی لباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کس مسلک کا پیرو ہے۔

دین کی بنیاد دلیل پر ہوتی ہے، اور دلیل نام ہے قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کا، جب کہ زیادہ تر مدرسوں میں دلیل نہیں پڑھائی جاتی، بلکہ اکابر کی تقلید کا مشروب پلادیا جاتا ہے، اور یہ اکابر بھی خیر القرون (صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم) کے نہیں بلکہ عہد زوال کے ہیں، ہر مسلک کے اکابر الگ الگ ہیں، اس لئے ان کے درمیان کوئی ما به الاشتراك نہیں، جب ان لوگوں سے دلیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ان کا قول ہوگا: ہمارے اکابر آپ سے زیادہ جانتے تھے، ان بیچاروں کو اندازہ ہی نہیں کہ اکابر کا حوالہ جہالت وضلالت ہے۔

آپ جب اپنے بچہ کی دینی تعلیم کا نظم کریں، تو تین باتوں پر خصوصی توجہ دیں۔

پہلی بات یہ کہ اسے عربی زبان پڑھنے، سمجھنے، بولنے اور لکھنے کی معیاری تعلیم فراہم کریں، قدیم نصاب تعلیم سے اس طرح بھاگیں جیسے انسان جذام سے پرہیز کرتا ہے، اس نظام میں عربی کا ذوق کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتا، ایک مردہ زبان پڑھائی جاتی ہے، جس کے پڑھنے والے نہ قرآن کی قدر کرسکتے ہیں اور نہ حدیث کی، اور نہ ہی عربی زبان میں کچھ لکھ بول سکتے ہیں۔

دوسرے اسے براہ راست قرآن وحدیث کی تعلیم دیں، خدا اور رسول کی عظمت دل میں راسخ

کریں، اس پر واضح کریں کہ قرآن وسنت کے مقابلہ میں کسی کا قول دلیل نہیں ہوسکتا، اسے سکھائیں کہ خدا کے یہاں تقوی کام آئے گا، مذہبی میک اپ کی وہاں کوئی قدر نہیں، اللہ تعالیٰ مسلک کے متعلق نہیں پوچھے گا، بلکہ وہ اپنی محبت، اپنا خوف، پیغمبروں کی پیروی کے متعلق سوال کرے گا۔

تیسرے اس کی عقلی تربیت کریں، یعنی وہ اپنے ماحول میں رہتے ہوئے دین کی معقولیت سمجھے، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے اس کی تشریح کر سکے، عقل جس قدر مضبوط ہوگی اسی قدر انسان فتنوں اور شکوک وشبہات سے دور ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے بچے کو صحیح دیندار بنائیں، اور دین کا داعی بنائیں، اسے تکفیر، تفسیق، تضلیل اور مناظرہ بازی جیسی آفتوں سے دور رکھیں، مناظرہ انسان کے دل کو مردہ کر دیتا ہے، اور اس سے صرف نفرت پیدا ہوتی ہے، جب کہ پیغمبر اس دنیا میں دلوں کو جوڑنے کے لئے آتے ہیں، ان کی دعوت خیر خواہی پر قائم ہوتی ہے، نہ کہ تنافس وتقابل پر۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک بنائے، اور اپنے بچوں کی صحیح تربیت کرنے کی توفیق دے۔

جواب از من بندۂ ناتواں:

انھوں نے کہا کہ ”اس وقت ہندوستانی مدرسوں میں دین کی تعلیم کے نام سے جو کچھ دیا جارہا ہے وہ بہت گھٹیا مال ہے“

گھٹیا مال کہہ کر پھر اس کی وضاحت کی کہ ”دین کے نام سے مسلک پڑھایا جارہا ہے، چونکہ مسلکوں کی کوئی حد نہیں، اس لئے شروع ہی سے فرقہ بندی کا عقیدہ ذہنوں میں راسخ کر دیا جاتا ہے، یعنی مسلمان امت واحدہ نہیں بلکہ فرق متحاربہ ہیں۔“

عرض ہے: وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ .

ترجمہ: اور اگر آپ کے رب چاہتے تو تمام لوگ ایک ہی راستہ اختیار کر لیتے، اور (لیکن) وہ ہمیشہ اختلاف ہی کرتے رہیں گے۔ سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کے پروردگار نے مہربانی فرمائی اور اسی (اختلاف باقی رہنے ہی) کے لئے تو ان کو پیدا کیا ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ لوگ ایک دین پر نہیں رہیں گے اسی طرح حضرت نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے۔ اِفْتَرَقَتِ الْيَهُودُ عَلَى إِحْدَى وَسَبْعِينَ فِرْقَةً،

وَافْتَرَقَتِ النَّصَارَى عَلَى اثْنَتَيْنِ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً، وَسَتَفْتَرِقُ هذِهِ الأُمَّةُ عَلَى ثَلاثٍ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً، كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً. قِيلَ: مَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ فَقَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ كَانَ عَلَى مِثْلِ مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي.

"یہود ایک بہتر (۷۱) فرقوں میں بٹ گئے، نصاریٰ بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے، اور میری یہ امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سب جہنم میں ہوں گے سوائے ایک کے۔ پوچھا گیا: یا رسولَ اللہ! وہ کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جو اس طریقے پر ہو جس پر میں اور میرے صحابہ ہوں۔"

اس میں بیان کر دیا گیا ہے کہ ایک ہی فرقہ جنتی ہے اس صورت میں فرقہ/ مسلک کی تعلیم درحقیقت دین کی تعلیم ہے۔

انھوں نے لکھا "مسلمان امت واحدہ نہیں بلکہ فرق متحاربہ ہیں۔"

یقیناً مسلمان امت واحدہ ہے بلکہ "کجسم واحد" لیکن اسلام میں فرق متضادہ کا انکار کون کرسکتا ہے، ہر ایک اپنے کے برحق ہونے کا دعوے دار ہے، اب ہم کسی مدرسہ میں پڑھنے گئے، کیا ہم کو یہ جاننے کا حق نہیں ہے کہ ہم ہی حق پر کیوں ہیں، دوسروں کے عقائد کی ہم کس دلیل کی بنیاد پر تردید کرتے ہیں۔

میں کسی مدرسے میں بغرض حصول تعلیم اور ابتغاء لوجہ اللہ داخل ہوا اور یہی نہ جان سکا کہ ان فرقوں میں کون حق پر ہے اور کیوں ہے تو پھر میرا مقصد ہی کہاں حاصل ہوا۔

آپ یہ کہیں کہ براہ راست قرآن وحدیث سے مضامین اخذ کرو، کسی طرح کا کوئی تقابل کسی کے فہم سے مت کرو تو عرض یہ کرنا ہے کہ اقوال متضادہ اور نظریات مختلفہ میرے سامنے ہیں کونسا نظریہ نصوص سے قریب تر ہے؟

مدارس کے اساتذہ ایک منہج و اصول پر چلتے ہوئے بعض راسخین فی العلم پر اعتماد کرتے ہوئے یہ اعتماد کہ یہ حضرات ورع و تقوی میں علم میں اور راست بات کو پہنچنے میں نیز دیگر نصوص کی آگاہی میں فوقیت رکھتے ہیں اور ان کی فہم صحابہ کی فہم سے زیادہ میچ کھاتی ہے۔ اس بنا ایک ہی مسلک والوں کے اقوال کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی کو اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اس گمان کے ساتھ کہ وہ معصوم نہیں تھے ان سے نصوص کے خلاف کوئی قول ظاہر ہو تو اس کو چھوڑنے میں بھی تردد نہیں کرتے ہیں۔ یہ تعلیم و تلقین کیوں کر گھٹیا مال ہوسکتی ہے؟

انھوں نے کہا کہ ”دین کی بنیاد خدا کی بندگی اور آخرت کی کامیابی کی تیاری پر ہے، جب کہ مسلک کی بنیاد ظاہری شناخت پر ہے،اس لئے مدرسوں سے فارغ ہونے والوں کی پوری توجہ کرتا پائجامہ اور ٹوپی پر ہوتی ہے، ہر مسلک کا لباس جدا ہوتا ہے،اسی لباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کس مسلک کا پیرو ہے۔“

غرض یہ کہ بندگی میں اعلی ترین بندگی توحید و عقائد و نظریات ہیں، ہم مدارس میں جائیں اور صرف ”صلح کل“ سیکھ کر آئیں ، عقائد و نظریات کو ہم نے اہمیت ہی نہیں دی یا اہمیت دی لیکن جتنا ہم کو قرآن و حدیث سے اپنی استعداد کے مطابق مل سکا۔ ہم نے قرآنی علم ”علم جدل“ کو کام میں لا کر ہر زمانے کے فرق ضالہ کو سمجھنا نہیں سیکھا، بس ہم نے اسی پر اکتفا کیا کہ ہم سب ایک ہیں، چوری نہیں کرنا ہے ، کسی کو برا بھلا نہیں بولنا ہے، ہم سب بھائی بھائی ہیں ، اور سب جنت کے اولین حقدار ہیں۔

کیا یہ سب باتیں ان نظریات و عقائد کے خلاف نہیں ہے جن کے بغیر ظاہری اعمال مقبول نہیں ہے۔

مدرسوں میں مسلکوں کی بنیاد پر ہمیں لڑنا نہیں سکھایا جارہا ہے بلکہ اپنے نظریات و عقائد پر اڑنا سکھایا جارہا ہے۔

ہم نے کسی استاذ کی لباس و پوشاک میں اس وجہ سے نقل نہیں کی کہ وہ ان کا خصوصی لباس ہے نہ انھوں نے ایسا کہا ہے ، بلکہ وہ اتباع رسول ہے لباس پوشاک اسی اتباع کا اثر ہے۔

———————

ایران اسرائیل جنگ مضمون وتبصرہ

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے جو دین حق بھیجا ہے، اس کی بنیادی خصوصیت: عدل، عدل کے معنی ہیں: ہر ایک کے ساتھ انصاف، حق کو قبول کرنا اور ظلم سے نفرت، چاہے وہ کسی انسان یہاں تک کہ جانور یا اللہ تعالیٰ کی کسی اور مخلوق کے ساتھ ہو، یہ دراصل انسان کی فطرت کی آواز ہے؛ اس لئے ایک شریف انسان ظلم کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس کا دل بے چین ہو جاتا ہے، اگر انسان اس کیفیت سے محروم ہو جائے تو اس کے اور درندہ کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ جائے گا، یہ فرد سے لے کر قوم اور حکومت تک سبھوں کے اخلاق وکردار کو تولنے کا معیار ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف اسلوب میں کم سے کم ۳۰؍مقامات پر قرآن میں عدل کا حکم دیا ہے، کم ہی کسی اور عمل کی اس درجہ تاکید کی گئی ہے۔

مسلمانوں کو خاص کر ہر شخص اور ہر مخلوق کے ساتھ عدل سے کام لینے اور ہر مظلوم کو ظلم سے بچانے کا حکم فرمایا گیا ہے: اگر چہ اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے؛ لیکن مسلمانوں کے ساتھ انسانی رشتوں کے علاوہ ایک دینی رشتہ بھی ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو خصوصی طور پر اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں عدل و انصاف سے کام لینے، اس پر ظلم کرنے سے بچنے اور اس کو ظلم سے بچانے کی تعلیم دی گئی ہے؛ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ، وَلَا يَسْلِمُهُ. مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللهُ فِي حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً، فَرَّجَ اللهُ عَنْهُ بِهَا كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا، سَتَرَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

(مسلم، کتاب البر والصلۃ باب تحریم الظلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۰)

ترجمہ: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس پر ظلم ہوتا ہوا چھوڑ دیتا ہے، پھر جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت میں کام آئے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کو پوری فرمادیں گے اور جو شخص کسی مسلمان سے کوئی مصیبت دور کر دے اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور فرمادیں گے اور جو مسلمان کسی مسلمان کی غلطی کو ڈھانپ دے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گناہ کو ڈھانپ دیں گے۔

مسلمانوں میں یہ مزاج ہمیشہ قائم رہنا چاہئے ، مگر افسوس کہ آج امت اس جذبہ اخوت سے محروم ہوتی جارہی ہے، بالخصوص عالمی سطح پر مسلمانوں کی صورت حال نہایت افسوس ناک اور انجام کے اعتبار سے تباہ کن ہے، اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد عالم اسلام پارہ پارہ ہوگیا، اس کو چھوٹی چھوٹی بے وزن اور بے اثر ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا گیا اور مغرب نے ایک منصوبہ کے تحت ان کو اس مقام تک پہنچا دیا کہ آج وہ اپنے ملکی مسائل کا فیصلہ بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے ، اشیاء کے تبادلہ کے لئے کون سی کرنسی استعمال کریں، اپنے ملک میں صنعتوں کو کس حد تک فروغ دینا ہے، ان کی زمین میں جو قدرتی خزانے ہیں، ان کو کس حد تک نکالنا ہے اور کس قیمت میں فروخت کرنا ہے، کن ملکوں سے دوستی رکھنی ہے اور کن ملکوں کی دشمنی میں خواہی نخواہی شامل ہوتا ہے؟ ان سب میں وہ مغربی طاقت کے دست نگر ہیں، یوں تو پوری امت مسلمہ اس صورتحال سے گزر رہی ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں سب سے ابتر صورتحال عالم عرب کی ہے اور شاید ان کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سزا ہے؛ کیوں کہ خلافت عثمانیہ کو توڑنے اور اسرائیل کو قائم کرنے میں اہل مغرب نے ان ہی کو آلہ کار بنایا تھا اور آج تمام عرب حکومتیں مغرب اور اسرائیل کے سامنے سجدہ ریز ہونے کو مجبور ہیں، عجمی مسلم ممالک جیسے ترکی، افغانستان، ملیشیاء وغیرہ تو کم سے کم زبان کھولتے ہیں: لیکن ان ملکوں میں زبان کو حرکت دینے کی جرات بھی نہیں ہے اور ان کو ایسا زہر دے دیا گیا ہے کہ ان کی غیرت وحمیت بھی دم توڑ چکی ہے۔

اس کی ایک واضح مثال عرب اور اسرائیل قضیہ ہے، اور اسرائیل چاروں طرف سے عرب ملکوں سے گھرا ہوا ہے، ان ہی ملکوں سے اسرائیلی جہاز گزرتے ہیں، وہ پڑوسی عرب ملکوں سے زور زبردستی سے پینے کا پانی حاصل کرتا ہے، فلسطینیوں پر کھلا ہوا ظلم کرتا ہے، بین الاقوامی قوانین کو تار تار کر رہا ہے، جب چاہتا ہے پڑوسی ملکوں پر بمباری کرتا ہے، اس کے ظلم کی وجہ سے فلسطینی فاقہ سے مر رہے ہیں، ساٹھ ہزار سے زیادہ لوگ شہید ہو چکے ہیں، جن انسانی حقوق کی امریکہ اور یورپ دہائی دیتا ہے، یہاں ہر دن ان کو پامال کیا جاتا ہے؛ لیکن فلسطین کے پڑوسی کسی مسلمان ملک کو یہ توفیق نہیں کہ وہ کم سے کم فلسطین کے مظلوموں کے لئے اپنی سرحدیں کھول دیں، ان میں سے صرف اردن اور مصر اپنی سرحدیں کھول دیتے اور خلیجی ممالک اپنی ضائع ہونے والی غذائیں فلسطین میں پہنچا دیتے تو اس طرح ان کی جانیں نہیں جاتیں اور اسرائیل کے حوصلے اتنے

بلند نہیں ہوتے، اب ایک مدت کے بعد یہ خوش آئند پہلو سامنے آیا ہے کہ ایران نے اسرائیل کو ظلم سے روکنے کی کوشش کی ہے اور اس میں اس کو کسی قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے، بجائے اس کے کہ عالم عرب اس جنگ میں ایران کے ہم نوا ہوتے اور اپنے مشترک دشمن اسرائیل کو جھکنے پر مجبور کرتے، صورت حال یہ ہے کہ یہ سب اسرائیل کو تحفظ دے رہے ہیں، سارے عرب اور خلیجی ممالک اسرائیلی فضائیہ کے لئے اپنی فضاء فراہم کر رہے ہیں اور ایران کی طرف سے جو میزائیل اسرائیل کی طرف جاتے ہیں، ان کو روکنے میں اسرائیلیوں کی مدد کر رہے ہیں، یہ کس قدر شرمناک بات ہے!

عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق اب کچھ لوگ اس کو شیعہ سنی نزاع کا عنوان دے کر ایران کو مجرم قرار دینے اور عرب پڑوسیوں کو بے قصور قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ نہایت افسوس ناک بات ہے، یہ لڑائی شیعہ سنی کی لڑائی نہیں ہے، یہ ظالم اور مظلوم کی لڑائی ہے، اسرائیل کھلا ہوا مجرم ہے اور فلسطین سے لے کر ایران تک پوری مسلم قوم واضح طور پر مظلوم ہے اور فلسطینیوں پر تو ایسا ظلم کیا جا رہا ہے کہ شاید تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملے جس نے نازیوں کی طرف سے ہونے والے یہودیوں کے ظلم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے؛ اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمان اس صورت حال کو محسوس کریں، اس موقع پر شیعہ اور سنی اختلاف کو ابھارنا مغرب کی سازش اور مغرب کے آلہ کار منافقین کی کوشش ہے۔

کچھ لوگ شیعہ سنی ایجنڈے کو طاقت پہنچانے کے لئے یہ کہہ رہے ہیں کہ جب فلسطین پر ظلم ہو رہا تھا تو اس وقت ایران نے کیا کچھ کیا؟ یہ ایک معقول سوال ہے، مگر سوال یہ ہے کہ عرب ملکوں کا جو فلسطینیوں سے دوہرا رشتہ ہے، ایک اسلامی اخوت کا اور دوسرا عربیت کا، انھوں نے اس سلسلہ میں کیا قدم اٹھایا؟ ایران اور اس کی ہم نوا طاقتوں نے تو فلسطین قائدین کو پناہ دی، لبنان اور یمن نے ان پر میزائل داغے، ان بزدلوں سے تو یہ بھی نہیں ہو سکا، حقیقت یہ ہے کہ کہ فلسطین سے بے اعتنائی برتنے کے مجرم بھی مسلم ممالک ہیں، لیکن اس سلسلہ میں فلسطین کے پڑوسی عرب ممالک اور پٹرول کی دولت سے مالا مال خلیجی ممالک سب سے بڑے مجرم ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں تو ان کو حساب دینا ہی ہوگا؛ لیکن دنیا میں بھی بے وزنی، ناطاقتی اور رسوائی کی شکل میں ان کو اس کی سزا مل ہی رہی ہے اور مستقبل میں بھی ملتی رہے گی۔

اسلام نے ہمیں دو بنیادی باتوں کی تعلیم دی ہے، ایک یہ کہ ہم ظالم کے مقابلہ مظلوم کا ساتھ دیں، دوسرے یہ کہ اگر دو ظالموں اور نامنصفانہ طاقتوں سے سابقہ ہو تو کم تر درجہ کو گوارا کریں اور بڑے دشمن سے دوری اختیار کریں، رسول ﷺ کے زمانہ میں جب رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ ہوئی تو مسلمانوں کا جھکاؤ رومیوں کی طرف تھا؛ کیوں کہ وہ توحید کے نبوت و رسالت کے اور تصور آخرت کے قائل تھے اور متعدد باتوں میں وہ مسلمانوں کی سوچ سے اتفاق رکھتے تھے، اس کے برخلاف ایران کے لوگ مشرکین سے قریب تھے اور کھلے ہوئے شرک میں مبتلا تھے، موجودہ حالات میں یہی رویہ قابل عمل ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان بعض بڑے اختلاف ہیں، خاص کر صحابہ کے بارے میں شیعہ حضرات کی جو سوچ ہے، وہ کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہے، یہ بھی ایک سچائی ہے کہ ایران کے دارالحکومت تہران میں مندر بھی ہے، چرچ بھی ہے، گرودوارہ بھی ہے اور یہودیوں کی عبادت گاہ بھی ہے، مجوسیوں کا آتش کدہ بھی ہے، لیکن اہل سنت کی کوئی مسجد نہیں ہے، میں نے خود یہ منظر تہران میں دیکھا ہے، یہی اعتراض اہل تشیع کو بھی سنی ملکوں پر ہے، خاص کر سعودی عرب پر، جہاں بعض شہروں میں بیس فیصد شیعہ آبادی ہے، مگر ان کو اپنے فرقہ کی مسجد بنانے کی اجازت نہیں ہے، یہ غیر معتدل، نامنصفانہ اور شدت پسندانہ رویہ ہے، جو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کو بڑھاوا دینے کا سبب بن رہا ہے، اس کی ایک مثال ابھی حالیہ رمضان المبارک میں سامنے آئی کہ طالبان حکومت نے اعلان کیا کہ تراویح لازماً بیس رکعت ہی ہوگی، آٹھ رکعت پڑھنے اور پڑھانے کی اجازت نہیں ہوگی، یہ حقیر خود بیس رکعت تراویح کا قائل ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ دلائل کی روشنی میں آٹھ رکعت نماز کے قائل ہیں، آپ ان کو بیس رکعت پڑھنے پر مجبور کریں۔

قرآن مجید نے ملے جلے مسلم اور غیر مسلم معاشرہ کے لئے بھی یہ اصول مقرر کیا ہے کہ ہر طبقہ اپنے طریقہ پر عبادت کرے اور دوسرے کے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دے: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ. (الکافرون:۶) جہاں مسلمانوں کے مختلف فرقہ اور مسالک کے لوگ آباد ہوں، ان کے لئے بدرجہ اولی یہی طریقہ ہونا چاہئے کہ ہر گروہ کو اپنی عبادت گاہ بنانے کی اجازت ہو اور اپنے اپنے طریقوں پر عبادت کرنے کا حق ہو، جبر و اکراہ کے ساتھ وحدت پیدا کرنے کی

صورت میں اتحاد کے بجائے انتشار وافتراق پیدا ہو جاتا ہے اور بحیثیت مجموعی ملت کمزور اور بے وزن ہو جاتی ہے۔

نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان مشترکہ امور زیادہ ہیں بمقابلہ اختلافی امور کے، عقیدہ توحید، عقیدہ رسالت، وحی، آسمانی کتاب، آخرت کا تصور، اہل بیت کا احترام، اسلام کے بنیادی فرائض، محرمات اور ممنوعات، ان سب میں اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان کافی یکسانیت پائی جاتی ہے، موجودہ حالات میں اسلام مخالف دشمن طاقتیں چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو، وہ اپنے اصل دشمنوں کی طرف سے توجہ ہٹالیں اور آپس میں دست وگریباں ہو جائیں؛ اس لئے ہمیں اس پر پوری توجہ رکھنی چاہئے؛ کیوں کہ عالم اسلام میں بھی اور غیر مسلم ممالک میں بھی اس وقت ملت اسلامیہ کو سب سے بڑھ کر اتحاد کی ضرورت ہے، ہمیں اس موقع پر ایران کی پوری اخلاقی مدد کرنی چاہئے، اس کے لئے دعاء کرنی چاہئے اور اختلاف کے باوجود اتحاد کے اصول پر عمل کرنا چاہئے اور ایرانی سربراہوں سے خواہش کرنی چاہئے کہ وہ متوقع جنگ بندی کو ایران اور اسرائیل تک محدود نہ رکھیں؟ بلکہ غزہ کی جنگ بندی کو بھی اس کے ساتھ مربوط کر دیں، اس سے پورے عالم اسلام میں ایران کا وقار بڑھے گا اور مسلمانوں کی وحدت واخوت میں اضافہ ہوگا، کاش! ایسا ہو جائے۔

تبصرہ از من بندۂ ضعیف:

مولانا کا یہ مکمل مضمون پڑھا: مولانا یقیناً بڑی شخصیت اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، صاف ستھرا تحقیقی مزاج رکھتے ہیں، اس کے باوجود ان سے دیگر کئی فقہی، ملی اور سیاسی مسئلوں میں اختلاف کیا گیا ہے، یہ نہ خلافِ ادب ہے اور نہ ہی قابل ملامت۔

مذکورہ مضمون کا تجزیہ کیا جائے تو وہ ہمارے نزدیک کچھ متفق باتوں (جن کی تعداد زیادہ ہے) اور کچھ قابل اختلاف باتوں کا مجموعہ ہے، سب کی فہرست بنانا اور کتر بیونت دشوار ہے۔ چند باتیں یہ ہیں:

۱) عربوں کی بے حسی، قضیہ فلسطین پر مجرمانہ خاموشی۔

۲) اسرائیل کے حد سے زیادہ ظلم و بربریت پر روکنے کی قدرت ہونے کے باوجود بے غیرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یو ایس کی غلامی کرنا۔ (یہ دونوں باتیں متفقہ ہیں)

۳)اگرچہ ایران نے کبھی عرب سنی ممالک کی طرف سچی دوستی کا ہاتھ نہ بڑھایا ہو، بلکہ ان ممالک میں پراکسی وار کے ذریعہ دہشت گردی کر رکھی ہو جیسا کہ احمد الشرع اور بعض افغان کے بیان سے واضح ہوا ہے، لیکن پہل کرتے ہوئے عرب ایران کا ساتھ دیتے (جس کے بارے میں ان عربوں کا بھی گمان یہ تھا کہ) یہ جنگ طول اختیار نہیں کرے گی بلکہ ڈرامائی طور پر اچانک بند ہو جائے گی اور پھر جنگ کی لپٹیں ہمارے ملک بھی آجائیں گی۔

مولانا کی مذکورہ رائے اچھی ہے لیکن یہ رائے زیادہ مضبوط ہوتی اگر غزہ کے متعلق کہا جاتا وہاں اسرائیل اور امریکہ جنگ کرنے میں اور ان کو سبق سکھانے میں مخلص ہیں۔

کیا بات ہے کہ ایران سے جنگ بندی اتنی سہل ہوگئی کہ رات کے آخری پہر جنگ بندی کی خبر موصول ہوگئی ٹرم کی جانب سے۔ گویا دو سوتنوں میں لڑائی تھی، شوہر نے کہا رک جاؤ ورنہ میں دونوں کو طلاق دے دوں گا تو دونوں رک گئے۔

اور غزہ سے جنگ بندی ٹرم کے پاجامے سے باہر ہوئی جارہی ہے، حالاں کہ ایران پر اقدامی حملہ ہوا تھا اس کا غصہ بجا تھا اتنی جلدی سرد پڑنا سوال پیدا کرتا ہے اور غزہ پر حملہ بقول اسرائیل دفاعی ہے یہاں سب ملیامیٹ کر کے بھی سکون نہیں آرہا ہے۔

۴)بعض لوگ اسے شیعہ سنی کا نزاع بتا رہے ہیں۔ یقیناً یہ غلط ہے، مذکورہ جنگ میں (جو ڈرامائی طور ختم ہو کر سرد ہو چکی ہے جب کہ وفات پانے والے مقتدر رہنما اور سائنس دانوں کی قبر کی مٹی ابھی تک خشک نہیں ہوئی) اس جنگ میں یقینا ایران کے ساتھ ہی ہمدردی ہونی چاہیے اسرائیل جس سے کمزور ہو ہم اس کے ساتھ ہیں، یورپی ممالک میں جنگ بندی اور اسرائیلی دہشت گردی کے حق میں احتجاج ہوئے ہم ان غیر مسلموں کے ساتھ ہیں تو ایران سے اس سلسلے میں دوری کیوں ہوگی۔

لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم ایران کو اسلامی ہیرو بنالیں اس کو حق جان لیں، خمینی انقلاب کو اسلامی انقلاب باور کریں، ایران کو نجات دہندہ بنا کر آئندہ کے لیے اس سے اچھی امیدیں قائم کرلیں، جس نے سنیوں اور ان کی عبادت گاہ کو ایران سے ختم کر دیا، جن کے ہاتھ پاکیزہ معصوم خونوں سے رنگین ہیں۔ دونوں باتیں جدا جدا ہیں۔

(۵)عربوں نے استطاعت و اقتدار کے باوجود فلسطینیوں کی مدد نہیں کی اور یمن و ایران

نے میزائیل داغے۔ ایک مدت کے بعد ایران نے اسرائیل کو ظلم سے روکنے کی کوشش کی۔
ان کی یہ بات سر آنکھوں پر کہ عرب حکمرانوں نے مسلمانوں کو شرمندہ کرکے بے غیرتی کی تاریخ رقم کردی ہے۔لیکن ایران کے میزائیل داغنے کو ظلم سے روکنا قرار دیا گیا! کیا مطلب ہے اس کا؟ قریب دو سال سے اہل غزہ تڑپ تڑپ کر شہید ہو رہے ہیں اب جنگ پر مجبوری یہ ظلم کو روکنے کی کوشش ہے؟
اپنی زمین اپنے قیمتی سرمائے کو ضائع کردینے کے بعد اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے اطلاع کرکے میزائل داغنا ظلم کو روکنا کیسے ہوسکتا ہے۔ پھر کیا چند دنوں میں ظلم رک گیا جو مزائیل روک دی گئیں؟
۶) مولانا کی یہ بات بہت پسند آئی: ''اسلام نے ہمیں دو بنیادی باتوں کی تعلیم دی ہے، ایک یہ کہ ہم ظالم کے مقابلہ مظلوم کا ساتھ دیں، دوسرے یہ کہ اگر دو ظالموں اور نامنصفانہ طاقتوں سے سابقہ ہو تو کم تر درجہ کو گوارا کریں اور بڑے دشمن سے دوری اختیار کریں، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جب رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ ہوئی تو مسلمانوں کا جھکاؤ رومیوں کی طرف تھا؛ کیوں کہ وہ توحید کے نبوت ورسالت کے اور تصور آخرت کے قائل تھے اور متعدد باتوں میں وہ مسلمانوں کی سوچ سے اتفاق رکھتے تھے، اس کے برخلاف ایران کے لوگ مشرکین سے قریب تھے اور کھلے ہوئے شرک میں مبتلا تھے، موجودہ حالات میں یہی رویہ قابل عمل ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان بعض بڑے اختلاف ہیں، خاص کر صحابہ کے بارے میں شیعہ حضرات کی جو سوچ ہے، وہ کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہے، یہ بھی ایک سچائی ہے کہ ایران کے دارالحکومت تہران میں مندر بھی ہے، چرچ بھی ہے، گرودوارہ بھی ہے اور یہودیوں کی عبادت گاہ بھی ہے، مجوسیوں کا آتش کدہ بھی ہے؛ لیکن اہل سنت کی کوئی مسجد نہیں ہے''
انھوں نے اس تحریر میں ایران کا ظالم ہونا بہت واضح اشارہ میں کہا ہے۔ اگرچہ عرب حکمران بھی ظالم ہیں لیکن ایرانیوں شیعوں سے بہت کم۔ اور بعض عرب ممالک میں شیعوں کے امام باڑے اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ بات ظاہر ہے اہل تشیع کی مسجدیں فساد کی جڑ ہوتی ہیں ایسی بہت سی خبریں ہیں کہ وہ سنی ممالک میں انہی مسجدوں سے ایران سے رابطہ میں رہتے ہیں، پھر شیعہ شنیعہ

کی اکثریت صحابہ کرام کو برا بھلا اور حضرات شیخین کو غاصب کہتی ہیں تو کیا شرعا اس طرح زندیقوں کی مسجدیں بنوانا چاہیے کہ وہ وہاں سینہ کوبی کرتے ہوئے صحابہ کرام پر سب وشتم کریں۔

۷) مولانا نے آخری بات یہ جو کہی جس کو مضمون میں مختلف رنگ سے فوکس کیا گیا حالاں اس سے اوپر والا پیرا گراف زیادہ فوکس کے لائق تھا مولانا نے فرمایا: ''نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان مشترکہ امور زیادہ ہیں بمقابلہ اختلافی امور کے، عقیدہ توحید، عقیدہ رسالت، وحی، آسمانی کتاب، آخرت کا تصور، اہل بیت کا احترام، اسلام کے بنیادی فرائض، محرمات اور ممنوعات، ان سب میں اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان کافی یکسانیت پائی جاتی ہے، موجودہ حالات میں اسلام مخالف دشمن طاقتیں چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو، وہ اپنے اصل دشمنوں کی طرف سے توجہ ہٹالیں اور آپس میں دست وگریباں ہو جائیں۔''

عرض ہے کہ سیاسی طور پر تو اتفاق کیا جا سکتا ہے اور یقینا ہمارے بڑوں نے اس مختصر جنگ میں ایران ہی کی حمایت کی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ان کی طرف سے دیے جانے والے دھوکے اور ان کی طرف سے کیے جانے والے ظلم سے انکھیں بند کر لیں پھر اگرچہ اکثر باتوں میں ان سے اتفاق ہے لیکن دین کے اندر بہت سی مرتبہ اقل کا اعتبار کیا جاتا ہے اور اسی کے مطابق پورے پر حکم لگایا جاتا ہے اور پھر اس کے مطابق ان کے ساتھ برتاؤ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے جیسے کوئی شخص پورے دین کو مانے ہر ہر بات میں اتفاق کرے لیکن نبی ﷺ کے آخری نبی ہونے کا انکار کر دے تو تمام متفقات کے باوجود ہم اس سے اختلاف کریں گے، دوری اختیار کریں گے اور اس پر اقل کا حکم لگائیں گے کہ یہ کافر ہے زندیق ہے اس جیسا ہی ان کے ساتھ برتاؤ کیا جائے۔

الامور بمقاصدھا: ایرانی خمینی انقلاب کے بعد ایران کے مقاصد کوئی ڈھکے چھپے نہیں ہیں، وہ اپنے علاقے مڈل ایسٹ میں سنیوں کو مغلوب کر کے ایک غالب طاقت بن کر رہنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ شیعہ مقتدر اعلی رہے اور اس کے ساتھ اسلامی پیشوائی بھی ہاتھوں میں رہے، مسلمان ان کو اپنا ہیرو جانے، برامکہ اور قرامطہ کی طرح ان کا طوطی بھی بولے، برسوں سے وہ اسی تگ و دو میں ہیں اور کافی حد تک کامیابی کی طرف ہیں، اس نے سنی ممالک میں پراکسی وار لڑا کر ان کو کمزور کیا اور ایٹمی طاقت بننے کے لیے پر تول رہا ہے۔

اسرائیل (امریکہ) اور ایران اس حد تک تو ساتھ ساتھ ہیں کہ دونوں کا مشترکہ دشمن سنی مسلمان ہیں۔ لیکن ایران کا ایٹمی طاقت کے لیے اقدام کرنا، یہ امریکہ کی نظر میں بھی حد تجاوزی ہے اور عربوں کے ساتھ امریکی دوستی میں رخنہ ہے۔ یہ بات کہ ایران کو ایٹمی طاقت بننے کی کھلی چھوٹ دی جائے۔ البتہ طاقت بڑھانے پر بالکلیہ روک تھام جو افغانستان اور عراق کے حق میں کی گئیں ان کو یہاں خلاف مصلحت سمجھا گیا ہے۔ ہر ملک کی اپنی ترجیحات اور مقاصد ہوتے اس وجہ کوئی دوستی پائندہ نہیں رہتی، ترجیحات پر زد پڑنے پر حلیف حریف ہوجاتا ہے۔

بہر حال ایران اور اسرائیل (امریکہ) ہی کو اور موجودہ جنگ ہی کو مدنظر رکھا جائے تو یقینا اس حساب سے ایران مظلوم ہے، کہ ہر ایک کو اپنا دفاعی نظام مضبوط کرنے کا اور قوت ومضبوطی حاصل کر کے مستحکم ہو جانے کا پورا حق ہے۔ اس حساب سے ایک عام مسلمان ایران کی پشت پر کھڑا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ وہ اسرائیل کو کمزور کر رہا ہے، مسلمانوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ مظلوم ہونے کے اعتبار سے تو ہوں گی لیکن برحق اور مستقل اسلامی ہیرو ہونے کے اعتبار سے ہرگز نہیں، جس کی ایران نواز کوششیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر دیگر سنی مسلمان ممالک کے ساتھ موجودہ اور سابقہ (ماضی قریب) ایرانی مظالم اور اس کے مقاصد کو دیکھا جائے تو وہ یقینا ظالم ہے اور اس سے خدشات اظہر من الشمس ہیں، کوئی بھی قوم چاہے وہ باطل پرست ہی کیوں نہ ہو اپنے مقاصد کے تحت ہی کام کرتی ہے۔

شیعوں کا اخبار میں ہیر پھیر کرنا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، کلام رسول میں بھی انھوں نے جھوٹی باتوں کو ہی ملایا ہے موجودہ جنگ میں بھی اس قدر جھوٹ نشر کیا جارہا ہے کہ انڈین گودی میڈیا کے ہم پلہ ہوتے نظر آرہے ہیں، جن کی بعد میں فضیحت ہوئی۔

سوشل میڈیا پر تو ایرانی نواز جھوٹے ویڈیو ڈال ہی رہے ہیں، دوسری طرف میڈیا عنوان لگا رہی ہے، ''ایران نے آج پھر مچائی تباہی، دو شہر تباہ''۔ ''فلسطین بس آزاد ہوا چاہتا ہے''۔ ''ایران نے اڑا دیا موساد کا ہیڈ کوارٹر''۔ ''ایران نے اسرائیل کی ڈیفینس سسٹم تباہ کر دی'' ''نیتن یاہو کے گھر پر ایران کا حملہ''۔ ''اسرائیل میں آگ کی بارش''۔ ''تل ابیب میں ایران نے نکال دیا تیل'' یہ سب فضول عنوانات ہیں۔ حالاں کہ پہلے حملے کے موقع پر جو الجزیرہ نے رپورٹ کی تھی کہ ایران نے ۱۰۰ یا ۱۵۰ بم پھینکے ہیں لیکن اکثر کو روک لیا گیا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ پہلی مرتبہ اسرائیل کو ان گھاتک بموں سے واسطہ پڑا ہے اور اس کا نقصان ہوا ہے، لیکن جتنا سوشل میڈیا پر پھیلایا جارہا ہے اتنا نہیں، اے آئی کے ذریعہ ویڈیو بنا کر اسرائیلی ہوائی جہاز جلتے ہوئے دکھائے جارہے ہیں، اور پورا شہر آگ کی لپیٹ میں دکھایا جارہا ہے۔ یقیناً دھمکیوں کی گھن گرج ہے جو پہلے سے زیادہ ہے لیکن زمین پر انکا مصداق کچھ زیادہ نہیں ہے۔

اسرائیل اگرچہ ایران کا زیادہ برا نہیں چاہتا لیکن اس بات میں اسرائیل مخلص ہے کہ ایران ایٹمی طاقت نہ بننے پائے، اور جس کی روک تھام کے لیے اسرائیل نے جو حالیہ علانیہ حملہ کیا کسی بھی ملک کے لیے پورے طور پر جنگ میں کود جانے کے لیے کافی ہے لیکن ایران ابھی بھی کم سے کم پر اکتفاء کرنا چاہتا ہے، اس سے پہلے ایران کے اندر اسماعیل ہنیئہ کو شہید کیا گیا جس میں ایران کا ہاتھ نہ ہونا بعید از عقل ہے، اس وقت کچھ قابل ذکر کام ایران نے نہیں کیا لیکن اب جب کہ خلاف توقع اسرائیل نے ذرا بھاری جھٹکا خود ایرانی اور ہندی جاسوسوں کی مدد سے دیا تو وہ بوکھلا گیا اور بوکھلاہٹ بھی منافقانہ ہے صرف راکٹ پھینکے جارہے ہیں۔ براہ راست جنگ مسلط کیے جانے کے باوجود کترا رہے ہیں۔ یقیناً اس جنگ سے مسلمانوں کو فائدہ ہے ظالم جس کسی سے کمزور ہو مظلوموں کا فائدہ ہے۔ کون عقل مند مسلمان ہوگا جو یہاں ایران کے بجائے اسرائیل کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ لیکن اپنی بصارت اور بصیرت کھلی رکھ کر ہر طرح کے دھوکے سے تو محفوظ رہنا ہوگا۔ بار بار ''یاہو'' کہہ چکا ہے کہ مشرق وسطی کے حالات کو بدلنا ہوگا، اور ظاہر ہے یہ کام اتنا آسان نہیں ہے اس کے لیے بھاری ضیاع بھی برداشت کیا جاسکتا ہے۔

ہم کو یاد ہے کہ اتاترک کو اسلامی ترکی ہیرو بنانے میں باطل نے از خود شکست کھائی تھی اور اس کے بعد اتاترک کو اپنے مفاد میں استعمال کیا تھا۔

———

عرب حکمراں سے بے محل خوش فہمی؛ تحریر وتبصرہ

تحریر از عمران صدیقی ندوی

ٹرمپ کے دورے کو لے کر عربوں پر اعتراض:

ہم لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم خیالی دنیا میں جی رہے ہیں یا یوں کہیں کہ ہم لوگ بغداد اسپین اور ترکی کے دور خلافت میں جی رہے ہیں، ہم لوگ اپنے ماضی سے نکل ہی نہیں پا رہے ہیں، ہم لوگ یا تو زمینی حقائق نہیں دیکھ پا رہے ہیں یا دیکھنا ہی نہیں چاہتے ہیں۔

امریکہ اس دور کا سپر پاور ہے جس طرح ایک زمانے میں ترکی سپر پاور تھا یا ایک زمانے میں بغداد سپر پاور تھا، سپر پاور کے سامنے دنیا کیسے جھکتی ہے اور جو نہیں جھکتا ہے اس کے ساتھ سپر پاور کیا کرتا ہے وہ سمجھنا ہو تو اس دور کی تاریخ پڑھ لو جب مسلمان سپر پاور تھے۔

جب ہوا مخالف ہو تو اس وقت ہوا کا مقابلہ نہیں کرتے بلکہ اپنا بچاؤ کرتے ہیں، جو درخت طوفان میں اکڑتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے جو ہوا کے ساتھ adjusted کرتا ہے وہ طوفان گزرنے کے بعد پھر سے کھڑا ہو جاتا ہے اور مزید طاقتور ہو جاتا ہے۔

عربوں نے وقت کی سپر پاور سے تجارتی معاہدے کر کے اپنے اور اپنے پڑوسی بھائیوں کو جس جنگ کے عذاب سے بچایا ہے اور امن کا معاہدہ کر کے اپنی آنے والی نسل کو تیار ہونے کا، طاقتور بننے کا جو موقع فراہم کیا ہے وہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ یہ تجارتی معاہدے عربوں کی مجبوری تھی یا سمجھداری۔

اس دورے کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھنا ہو تو اہل شام سے پوچھو اور ان شاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب اہل فلسطین کے مسئلہ کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکلے گا اور وہاں بھی امن کی ہوا چلے گی اور ان کی نسلوں کو بھی امن کے ماحول میں پنپنے کا، بڑھنے کا، ترقی کا اور طاقتور ہونے کا موقع ملے گا۔

تبصرہ از من بندۂ ھیچ مداں:

بڑی بے غیرتی اور حماقت سے پُر تحریر ہے، بزدلی کو سمجھ داری اور بے حمیتی کو دور اندیشی اگر کہا جانے لگے تو اس سے بڑی حماقت کیا ہو گی۔

پہلے کہا کہ امریکہ سوپر پاور اور ایک آندھی اور طوفان ہے، اس طوفان کے سامنے اکڑا

نہیں جاتا بلکہ سپر ڈال دینے پڑتے ہیں اڈجسٹ کرنا پڑتا ہے، پھر کہہ رہے ہیں کہ آنے والا وقت بتائے گا کہ یہ مجبوری نہیں سمجھداری اور دور اندیشی ہے، جس مجبوری کو پہلے ثابت کیا اسی کی بعد میں نفی کر رہے ہیں!

سوال دماغ میں آتا ہے کہ یہاں مجبوری کیسی ؟ کیا امریکہ ایسا طوفان ہے جس کے سامنے اکڑا نہیں جاسکتا۔ بقول شیخ الاسلام یہ سوپر پاور ہے تو اللہ تعالیٰ سپریم پاور ہے۔

کیا دانا پانی امریکہ کے ہاتھ میں ہے؟ کیا عزت ذلت ترقی تنزلی خالق کائنات امریکہ کے ہاتھ میں دے کر فارغ ہوگیا ہے؟

کیا اس زمانے میں بھی امریکہ کو شکست دینے والے طالبان اپنا ملک طوفان کے سامنے اکڑ کر نہیں چلا رہے ہیں؟ کیا ماضی قریب میں ویتنامیوں نے امریکہ کا غرور خاک میں نہیں ملا دیا تھا؟ کیا چین امریکہ سے اکڑ کر معاشی برتری کی طرف رواں نہیں ہے؟

کیا ایسی چیز ہے جو عربوں کے پاس نہیں ہے جس میں وہ امریکہ کے بنا گھٹنوں پر آجائے گا؟ ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن تمام عربوں کے پاس مادی دنیا میں یقینا ایسی چیز موجود ہے جس سے وہ امریکہ کو چند دنوں میں گھٹنوں پر لاسکتے ہیں۔

عربوں کے ان اقدام میں نہ دور اندیشی ہے نہ سمجھداری نہ مجبوری یہ صرف دنیا کی محبت، بزدلی، حماقت، بے غیرتی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔

———

دار العلوم دیوبند کے نظام تعلیم پر بے جا تبصرہ اور اس کا جواب

کیا دار العلوم دیوبند ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم ہے؟

راقم: ابوحسان پوترک

یہ تحریر ایک فکری بحث کا تسلسل ہے جو ایک مدرسے میں ہمارے درجہ کی ''فکر اسلامی'' کی کلاس میں ہوئی۔ ہم اس پر غور کر رہے تھے کہ اسلامی نظام تعلیم کے خدوخال دورِ حاضر میں کیا ہو سکتے ہیں۔ اسی دوران ایک طالب علم نے کہا کہ: ''دار العلوم دیوبند کا ماڈل ہی کافی ہے، ہمارے اکابر نے جو قائم کیا، وہ مکمل سوچ سمجھ کے ساتھ کیا۔'' کسی اور نے حضرت شیخ زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ مشہور قول بھی نقل کیا جس میں مغربی نظام تعلیم پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ یہ باتیں بظاہر قابل احترام لگتی ہیں، مگر جب ہم نے اس پر منطقی اور تعلیمی بنیادوں پر غور کیا کہ آیا مدارس کا موجودہ نظام تعلیم پورے ہندوستانی مسلمانوں کی ہمہ جہت ضروریات پوری کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر حضرت شیخ کی اس تنقید کو مطلق درست مان لیا جائے تو پھر بعد میں خود انہی مدارس میں بعض علوم کی شمولیت کس بنیاد پر درست مانی گئی؟ تو ہم پر ''مخالفِ دیوبند'' ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔

لہٰذا اس فکری رکاوٹ اور مغالطے کے ازالے کے لیے یہ تحریر لکھی جا رہی ہے — جو تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ اصلاح، فہم، اور تعلیمی توازن کی وضاحت کے لیے ہے۔ آئے دیکھتے ہیں علمی اور تاریخی لحاظ سے اس مسئلہ کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا دار العلوم دیوبند مسلمانوں کے لیے ایک جامع نظام تعلیم فراہم کرتا ہے؟ یہ سوال بظاہر ایک ادارے کے دائرہ کار سے متعلق معلوم ہوتا ہے، مگر اس کی گہرائی میں پورا اسلامی تعلیمی ورثہ، فکری سمت، اور موجودہ مسلم معاشرے کا مستقبل پوشیدہ ہے۔ دار العلوم دیوبند ایک اہم تاریخی اور فکری مقام رکھتا ہے، لیکن اس کی حیثیت اور دائرہ کار کے بارے میں جو مغالطے پھیلائے گئے ہیں، ان کا تجزیہ ضروری ہے تا کہ ہم یہ طے کر سکیں کہ اس ادارہ کو ''نظامِ تعلیم'' کا نمائندہ کہنا خود اس کی حیثیت، اس کے مقام و مرتبہ اور اس کی اصل حقیقت سے ناواقف ہونے کا نتیجہ ہے۔

تاریخی تناظر: قیام کا پس منظر

دارالعلوم دیوبند ۱۸۶۶ء میں ایک ایسے وقت میں قائم ہوا جب ہندوستانی مسلمان سیاسی، سماجی اور تہذیبی زوال کے شکار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں پر انگریزوں کی تہذیبی یلغار شدید ہو چکی تھی۔ انگریزی تعلیم، عیسائی مشنری سرگرمیاں، اور ہندو نشاۃ الثانیہ نے مسلمانوں کی شناخت پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند دراصل ایک ''دفاعی حکمتِ عملی'' کے تحت قائم ہوا تا کہ اسلامی عقائد و اقدار کو محفوظ رکھا جا سکے۔ اس کا مقصد نہ تو ریاستی نظام چلانا تھا، نہ ہی ایک جامع و ہمہ گیر نصاب تشکیل دینا۔ بلکہ، یہ ایک ردِ عمل تھا، ایک نفسیاتی اور فکری قلعہ بندی تھی۔ جس نے اپنے مقاصد میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی جو ان بانیئن کی ایمانی فراست کی دلیل ہے۔

تحفظ اور تعمیر، دو ذہنی دنیائیں:

تحفظ کی نفسیات: تحفظ کا رجحان عموماً ماضی پر مرکوز ہوتا ہے۔ یہ ردِّ عملی (reactive) ہوتا ہے، جس میں اصل مقصد موجود خطرات سے بچاؤ ہوتا ہے۔ اس میں تخلیقی وسعت، تجربہ پسندی اور مستقبل بینی کم ہوتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا قیام اسی رجحان کا عکس تھا—ایسا تعلیمی ادارہ جو مسلم شناخت کو کے لیے بنایا گیا، نہ کہ ''تخلیق'' یا ''تعمیر'' کے لیے۔

تعمیر کی نفسیات: اس کے برعکس، تعمیراتی سوچ میں امکانات، تجدید، تنقید، اور مسائل کے حل تلاش کرنے کی کاوش شامل ہوتی ہے۔ یہ سوچ مستقبل کو ذہن میں رکھ کر چلتی ہے، اور علم کو طاقت، آزادی، اور ترقی کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے روشن دور، مثلاً بغداد یا قرطبہ، اسی تخلیقی ذہنیت کی پیداوار تھے۔

دیوبند کا منہج، دینی تحفظ یا تعلیمی ہمہ گیری؟

دارالعلوم دیوبند کا نصاب ''درسِ نظامی'' پر مبنی ہے، جو ۱۸ویں صدی کے ہندوستانی علماء نے ترتیب دیا۔ اس میں حدیث، فقہ، منطق اور عربی ادب شامل ہیں، لیکن جدید علوم جیسے سائنس، فلسفہ، معاشیات، نفسیات، سیاسیات اور ٹیکنالوجی موجود نہیں۔ یہ نصاب ایسے علما تیار کرتا ہے جو دینی امور میں ماہر ہوں، مگر عصری دنیا میں رہنمائی دینے کی محدود صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس نصاب کا زور ''محفوظ رکھنے'' پر ہے، ''تبدیل کرنے'' یا ''ترقی دینے'' پر نہیں۔ اس لئے

اس کے ذمہ وہ کام ڈالنا جو اس کے مقاصد میں شامل ہی نہیں، معیار اور مقتضیات کے لحاظ سے سخت امتحان میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

مثال کے طور پر، ایک دیوبندی طالب علم کو ''ڈیٹا سائنس'' یا ''انٹرنیشنل ریلیشنز'' کی تعلیم نہیں دی جاتی، جو کسی قومی نظام کا لازمی حصہ ہیں۔ یہ ادارے بنیادی طور پر مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں اور دیگر مذاہب کے طلبہ کو شامل نہیں کرتے۔ نیز، یہاں صرف ایک مذہبی مکتبِ فکر (حنفی) کو فوقیت دی جاتی ہے، جو ملی وحدت کے تصور کو بھی پورا نہیں کرتے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ''ڈیجیٹل انڈیا'' یا ''میک ان انڈیا'' جیسے منصوبے قومی ترجیحات ہیں، وہاں دینی مدارس کا روایتی نصاب ان اہداف میں کوئی کردار ادا نہیں سکتا اور نہ ہی یہ اس کے مقاصد میں شامل ہے۔

قرآنی فلسفۂ تعلیم اور دارالعلوم دیوبند:

قرآن علم کو ''تفقہ''، ''تدبر''، ''تفکر''، ''حکمت'' اور ''تسخیرِ کائنات'' سے جوڑتا ہے۔ قرآن بار بار مشاہدہ، عقل، تدبر اور علم کی وسعت پر زور دیتا ہے۔ (جیسے: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ، اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ) اسلامی تہذیب کی عظمت اس وقت نمایاں ہوئی جب دین و دنیا کے درمیان کوئی خلیج نہ تھی۔ ابنِ سینا، الرازی، الفارابی، ابنِ رشد — یہ سب نہ صرف قرآن وسنت کے عالم تھے، بلکہ سائنس، فلسفہ اور طب کے بھی ماہر تھے۔

دارالعلوم دیوبند اس جامع اسلامی تصورِ علم کا مدعی نہیں رہا۔ اس نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی تشخص اور قدیم اسلامی علوم کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری قبول کی تھی، مسلمانوں کے معاشی سماجی اور سیاسی وجود کی بقا و ترقی کا منصوبہ اس کے منشور میں شامل نہیں تھا، شخصی اور انفرادی صلاحیتوں نے ان میدانوں کو اپنی جولان گاہ بنایا ضرور تھا مگر وہ دارالعلوم کے تعلیمی مقاصد کا نتیجہ نہیں تھا۔

جواب از من بندۂ ناچیز:

صاحب تحریر کی باتیں ناقابل فہم اور سمجھ سے پرے ہیں، ایسا لگتا ہے، طالب علم کے سوال کے بعد اپنے ذہن میں موجود جو ردو قدح اور ذہنی الجھنیں تھیں وہ اَلل ٹپ رقم کر دیں ہیں۔ جو باتیں سمجھ سکا ہوں اس حساب سے عرض ہے؛

عنوان ''کیا دار العلوم دیوبند ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم ہے؟''اس کے بجائے یہ ہونا چاہیے تھا ''کیا دار العلوم دیوبند ہندوستان میں مدارس کا نظام تعلیم ہے''تا کہ گفتگو ایک سمت میں رہے۔

راقم موصوف اپنی اس تحریر میں دار العلوم کے نصاب تعلیم کے ناتمام ہونے کو بھی بتا رہے ہیں اور دار العلوم کے دامن پر دھبہ لگنے سے بھی بچا رہے ہیں۔ دیوانگی بھی ہے اور شکایت بھی۔

مقصود صاحب تحریر کا یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ اہل مدارس اپنے اپنے نصاب میں دار العلوم کے نصاب و نظام تعلیم پر اکتفاء کرنے کے تصور کو ختم کریں اور جدید وعصری علوم کو نظام و نصاب کا حصہ بنائیں۔وجہ اس کی یہ ہے کہ دار العلوم کے نصاب و نظام میں تحفظ پیش نظر تھا اور تحفظ کی دنیا میں نہ زیادہ تجربہ ہوتا ہے نہ تعمیراتی وسعت، اور مستقبل بینی و دور اندیشی بھی کم کم ہی ہوتی ہے۔

جب کہ تعمیراتی سوچ میں یہ چیزیں بھر پور ہوتی ہیں، اس میں جامع اسلامی تصور ہوتا ہے اور تدبر و تفکر بھی وافر ہوتا ہے۔

جیسے ابن سینا و ابن رشد عالم تھے سائنس فلسفہ و طب کے واقف کار بھی یہ ''اَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ'' کی ایک مثال ہے۔

(راقم تھوڑا وسعت ظرفی سے کام لیتے اور اس میں ہمارے اویسی صاحب جو آج کل بہت دھویں دار علمی تقریریں کر رہے ہیں ان کا نام بھی شامل کر لیتے، اس کے علاوہ پتا نہیں کہ سرسید اور غامدی صاحب کو کیوں بھول گئے)

بہر حال راقم موصوف کہنا یہ چاہتے ہیں ان مدرسوں سے جو دار العلوم کے طرز پر جاری ہیں، آپ ذرا غور کریں دار العلوم کے بنا کے وقت بانئین حالت دفاع میں تھے، ان کو بہت خطرات لاحق تھے اس وجہ سے انھوں نے تحفظ کو پیش نظر رکھ کر کم دور اندیشی کے ساتھ نظام و نصاب طے کیا ہے۔

اب ہم کو اور آپ لوگوں کو ماشاءاللہ کوئی خطرہ نہیں ہے، حالت اقدام میں ہیں تو تعمیر ملت کو پیش نظر رکھ کر آپ حضرات کو نظام و نصاب میں دار العلوم کی رٹ لگانے سے باز رہنا چاہیے۔

لہٰذا میں ببانگ دہل کہنا چاہتا ہوں کہ جس طالب علم نے یہ کہا: ''دار العلوم کا ماڈل ہی کافی

ہے ہمارے اکابر نے جو قائم کیا وہ مکمل سوچ سمجھ کے ساتھ کیا'' اسی طرح دوسرے طالب علم کی بات بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے جس نے شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ نقل کیا لہٰذا ہمارے مدرسوں کو تعمیراتی سوچ کے ساتھ نیا نصاب و نظام کی ضرورت ہے، ہاں ہم اس تعمیراتی نصاب و نظام کے لیے الگ مدرسے نہیں بنا سکتے لیکن تم کو ضرور مشورہ دیں گے کہ تم ہمارے مشورے پر عمل کرو اگرچہ ہم نے ایسا کوئی نمونہ آپ کے سامنے پیش نہیں کیا کہ جو آپ کو دکھایا جا سکے۔ہاں دارالعلوم کے نصاب و نظام کے کئی نمونے ہیں لیکن ہمارے پاس نمونہ نہیں ہے ہم آپ کے لیے مناسب یہی سمجھتے ہیں کہ آپ لوگ بغیر نمونے ہی کے ہمارے مشورے پر بغیر سوچے سمجھے عمل کریں۔

کیا یہ بات درست ہے کہ بانیان دارالعلوم دیوبند کی سیاسی پختگی، عقل و دور اندیشی اور تعمیری سوچ ہمارے زمانے کے مصلحین امت سے کم تھی؟ ان کے ذہن کا دائرہ کم وسیع اور فکر و سوچ کم اونچی تھی؟ وہ غلامی کی زنجیروں میں تھے اور ہم ازاد ہند کے باسی ازاد اور زیادہ بہتر عقل والے ہیں؟ کیا وہ اسلامی ہند کے قریب تھے یا ہم؟ سیاست اسلامی سے ان کو زیادہ واسطہ پڑا یا ہمیں؟ مغرب سے برسر پیکار رہ کر انہوں نے اپنی قوت و ارادے کو بالیدگی دی تھی یا ہم نے جو سیاہ انگریزوں کے غلام بنے بیٹھے ہیں۔ ذرا بتائیں تحفظ و دفاع کیا ہمیں لاحق نہیں ہیں؟

بات درحقیقت یہ ہے بانیان دار العلوم نے اپنے عزم و حوصلے اور قوت و استقلال کی وجہ سے حالت دفاع میں بھی ایک ایسا بہترین نظام ونصاب ہمیں دیا ہے جس کی وجہ سے آج پورے برصغیر میں دین و اسلام کی حالت دوسرے ملکوں سے قدرے غنیمت ہے۔ اور آج دار العلوم اور اس شاخیں اس قدر پھیل گئی ہیں کہ ساری دنیا میں پھل دے رہی ہے۔

اگر نظام و نصاب ناکام اور دفاع و مجبوری کی پیداوار ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ تو نہیں نکلنا چاہیے تھا۔

———

کیا قابل استعمال چیزوں کے لیے سودی قرض لینا جائز ہے؟

سوال: جاوید احمد غامدی کا کہنا یہ ہے کہ اگر سودی قرض اس لیے لیا جائے کہ اس سے گھر یا گاڑی خریدنا ہے تو وہ جائز ہے۔ وہ سودی قرض منع ہے جو بوجہ غربت کھانے کے لیے لیا جائے۔ قابل استعمال اشیاء پر سود نہیں ہے، ہاں قرض پر اگر منفعت کا مطالبہ کیا جائے تو اسے قرآن سود کہتا ہے۔سرمایہ کاری بالکل الگ چیز ہے، آپ نے قرض کا آٹا خریدا، کھالیا اب وہ ختم ہوگیا لہٰذا اس پر سود لینا جرم اور ظلم ہے۔اگر آپ نے قابل استعمال اشیاء مثلاً گھر خرید لیا تو اب یہ موجود ہے اس پر سود لینا جائز ہے جیسے اس کا کرایہ لینا جائز ہے۔

جواب: یہ صاحب انکار حدیث سے مطعون ہیں۔قرآن کریم کو لغت یا کہہ لیجیے اس کے ترجمہ سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور طرح طرح کے گل کھلاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تعدد ازدواج کا جواز ، غزوہ احد میں شہادت کی کثرت سے قلت رجال ہونے کے سبب تھا!!!

اب کوئی کہاں جاکر سر پھوڑے ؟ یہ صاحب گمراہی کا شوشہ چھوڑ کر چلے گئے ، انھیں اپنے پر کیے جانے والے رد سے کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ انھوں اپنے حصہ کا کام کرلیا ہے۔

مذکورہ ویڈیو میں بھی انھوں نے قرآن کو لغت تو کجا صرف اپنی فہم کے اعتبار سے سمجھا ہے ، احادیث و اجماع امت تو درکنار خود لغت بھی اس مفہوم کا انکاری ہے۔

لغت میں ربا کا معنی زیادتی ہے ، ان صاحب نے بغیر کسی قرینے کے، بغیر سنت اور اقوال صحابہ کے فرمایا" وہ زیادتی جو اس مال کے عوض لی جائے جس مال کو وہ لے کر فنا(صرف) کر دے ، کھالے پی لے۔یہ ضرورت کے لیے قرض لیا اس پر اللہ تعالی فرماتے ہیں آپ سود نہ لیں اس کو ربا کہا جاتا ہے۔لہٰذا اگر بینک سے سودی لون لیا گیا تو لینے والا وہ رقم استعمالی چیزوں کے لیے لے رہا ہے ، گویا کہ اس بینک نے (سود قرض دینے والے نے) اپنی رقم کو استعمالی چیزوں میں(گھر کار کارخانہ وغیرہ میں) تبدیل کر دیا اور استعمالی چیزوں پر سود نہیں ہوتا جیسے میں یہ میز آپ کو کرائے پر دوں اور کرایہ لوں!!!"

یہ خلاصہ ہے موصوف کے کلام کا ، اب اس کو سمجھنے کی کوشش کریے اور سر دھنیے۔

دونوں میں جو فرق انھوں نے بیان کیا ہے وہ ناقابل فہم ہے ، سامنے بیٹھے افراد کیا سن کر

سر ہلا رہے ہیں واللہ اعلم۔

سمجھیے: میں نے آپ (بینک) سے اپنی ضرورت کے لیے قرض لیا اس کو اپنی ضرورت میں صرف کر کے فنا کر دیا اس پر زیادتی سود ہے۔

پھر میں نے اپنی ضرورت کے لیے آپ (بینک) سے قرض لیا اور اس سے اپنی کار یا گھر کی ضرورت پوری کر کے کار یا گھر خرید لیا اور اس قرض پر لی گئی رقم صرف کر دی، یہ سود نہیں ہوا۔ کیوں ایسا؟

تو غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ دوسری صورت میں آپ (بینک) نے وہ رقم کار یا گھر سے مبدل کر کے دی ہے۔ گویا اس نے پیسے نہیں دیے کار یا گھر دیا ہے (اب آپ سر پٹکیے غامدی صاحب اپنے گھر چلے)

اس احمقانہ لوجک کا کیا جواب دیا جائے۔

دونوں جگہ قرض پر زیادتی لی گئی ہے، حدیث میں ہے ہر قرض جو کسی منفعت کا باعث بنے وہ سود ہے۔ چاہے رقم صرف و فنا کر کے ضرورت پوری کرے چاہیے استعمالی چیزیں خرید کر ضرورت پوری کریں یا کسی اور مصرف میں استعمال کرے۔ انھوں اپنی ذکر کردہ قید کونسی آیت سے نکالی ہے؟ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

کیا زمانہ جاہلیت میں صرف کھانے پینے کے لیے قرض لیا جاتا تھا؟ عربوں میں تجارتی سرگرمیاں کافی حد تک تھی، مکی حضرات کسان نہیں بلکہ تجار تھے ہر گھر میں تاجر ہوتا تھا۔ تجارت کے لیے سودی قرض نہ لینے کا انکار بغیر دلیل کے نہیں کیا جاسکتا، جب کہ اس کا باعث موجود ہے، بدر سے پہلے والے تجارتی قافلے میں تو مکہ کے باشندگان میں سے ہر مرد و عورت کی رقم لگی تھی۔ کیا سب کے پاس اپنی ذاتی رقم موجود تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان میں سے کسی نے تجارتی سودی قرض لیا ہے، ہاں باعث و حامل و سبب موجود ہے۔

———

طالب علموں پر سختی کرنے کے جواز پر حدیث بدء الوحی سے استدلال

ایک مولانا صاحب نے طالب علموں کے مارنے پر حدیث بدء الوحی کے ذریعہ سے استدلال کیا جس میں حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت نبی کریم ﷺ کو گلے لگا کر بھینچا تھا حتی کہ آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا تھا: فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ۔ ترجمہ: جبریل نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ وہ مجھے دباتے ہوئے انتہائی مشقت تک پہنچ گئے۔

جواب: قابل اعتراض بیان ہے۔ پورے بیان میں حصول علم کے لیے تکلیف اٹھانا اور تحصیل علم کے لیے تکلیف دینا ان دونوں کو خلط ملط کر کے بیان کیا ہے۔

حدیث بدء الوحی سے استاد کا طالب علم کو مارنے پر استدلال یا استیناس کرنا غیر صحیح ہے۔

شیوخ الحدیث نے اس حدیث کی تشریح میں متعدد علماء کے اقوال نقل کیے ۱۵، ۲۰ اقوال کشف الباری میں نقل کیے گئے ہیں۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

انہوں نے واقعۂ بدء الوحی سے اس بات پر بھی استدلال کیا کہ مارے بغیر حصول علم ہو ہی نہیں سکتا ورنہ حضور ﷺ تو معصوم تھے ان کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت تھی۔

حصر پر یہ استدلال یا استیناس بھی عبث ہے۔ اور مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف ہے۔

اخذنی و غطنی حتی بلغ منی الجهد کی حکمت:

مختصر اعرض ہے: یہ دبانا اس لیے تھا؛ تا کہ حضور ﷺ کا قلب اطہر ہر خیال سے پاک ہو جائے، نیز آپ کو اس بات پر تنبیہ کرنا تھا کہ جس قول کا آپ پر القاء ہوگا، وہ ثقیل ہو گا، یا یہ بتانا تھا کہ قرآت آپ کی قدرت میں نہیں ہے، اگر چہ آپ کو مجبور کیا جائے، یا اس بات پر تنبیہ مقصود تھی کہ یہ جو کچھ آپ کو نظر آرہا ہے، وہ خیالات اور اوہام نہیں ہیں؛ بل کہ حقائق ہیں۔

ہمارے اکابر مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا زکریا کاندھلوی ثم مہاجر مدنی بیان فرماتے ہیں کہ یہ القائے نسبت کے لیے تھا۔ یا اس وجہ سے کہ وحی پر ایمان مرتب ہوتا ہے اور ایمان میں تین چیزیں ضروری ہیں قول فعل اور نیت اس وجہ سے تین مرتبہ دبوچا گیا بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس سے شدت تلاوت وحفظ، شدت فہم معانی اور شدت تبلیغ کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت مولانا مرتضی حسن چاندپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی ذہانت اور فراست سے اول روز ہی سمجھ گئے تھے کہ میرے اوپر کتنی بڑی ذمہ داری ڈالی جارہی ہے اس لیے

اپ نے ماانا بقارئ فرمایا یعنی اس ذمہ داری کا سنبھالنا اور انجام دینا مجھ جیسے ضعیف البنیان انسان کے لیے بہت مشکل اور دشوار ہے تو جبرائیل امین نے اپ کو دبوچا ایک مرتبہ پھر دوسری مرتبہ پھر تیسری مرتبہ تا کہ اپ کو یہ احساس ہو کہ اللہ تعالی نے اپ کے اندر بوجھ برداشت کرنے اور اسے اٹھانے کی صلاحیت رکھی ہے چنانچہ جبرائیل امین کے تین دفعہ دبانے کے بعد اپ کو احساس ہوا اور اپ نے وہ ایات تلاوت کر لیں جو کہلوائی جارہی تھیں۔

اگر کسی عالم دین نے اس حدیث سے استاد کا طالب علم کو مارنے پر استیناس کیا ہو تو وہ ضعیف ہے۔

مقرر صاحب نے کہا جو اس کے خلاف بولتے ہیں وہ قران کی وحی کے خلاف ہیں۔ حالانکہ انھوں نے کوئی صحیح دلیل ذکر نہیں کی۔ نیز تحصیل علم کے لیے طلبہ کو مارنے کے خلاف ہمارے کئی اکابر ہیں جن میں قابل ذکر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ کیا یہ سب بھی قرآن کی وحی کی روح سے ناواقف ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے تکلیف اٹھانے اور تکلیف دینے کو خلط ملط کر کے یہ کہا کہ جو اس کے خلاف ہیں ان کو مسلمان قوم کہلانے کا حق نہیں ہے۔ حالاں کہ تحصیلِ علم کے لیے تکلیف اُٹھانا تو مسلم ہے لیکن مار کر تکلیف دینا غیر مسلم اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ اس کا اس حدیث میں کہیں ثبوت نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ ارشاد گرامی موجود ہے: عَلِّمُوا وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا، وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا، وَإِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ۔ أخرجہ أحمد (۲۵۵۶)[حدیث صحیح]

"تعلیم دو اور آسانی پیدا کرو، سختی نہ کرو۔ اور خوشخبری دو، نفرت نہ دلاؤ۔ اور جب تم میں سے کوئی غصے میں آجائے تو اُسے چاہیے کہ خاموش ہو جائے۔"

مزید وضاحت کے لیے شکیل منصور قاسمی کی ایک تحریر نقل کی جاتی ہے:

علومِ شرعیہ کے حصول میں محنت و مشقت کی حقیقت:

علومِ شرعیہ کا حصول پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ صبر و ثبات، ریاضت، محنت و مشقت اور جہدِ مسلسل کا متقاضی ہے۔ علم کا نور اسی وقت میسر آتا ہے جب طالبِ علم اپنی راحت قربان کرے، اپنے نفس کو تھکائے اور مشقت کو گلے لگائے۔ جس طرح شمع اپنی روشنی کے لیے خود کو پگھلا دیتی

ہے، اسی طرح علم کے متلاشی کو بھی اپنی ذات کو محنت کی بھٹی میں ڈالنا پڑتا ہے۔

ابتدائے وحی کے واقعے میں بھی یہی حقیقت جھلکتی ہے۔ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو سیدِ کائنات ﷺ کو اس کے ثقل اور شدت کو برداشت کرنا پڑا۔ حدیثِ پاک کے الفاظ "حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ" اس بات کی شہادت ہیں کہ وحی کا تحمل آسان نہ تھا۔ یہ کیفیت حضور ﷺ کو تکلیف دینے کے لیے قطعی نہ تھی، بلکہ اس امر کی علامت تھی کہ وحی کا بار گراں ہے اور اسے اٹھانے کے لیے غیر معمولی صبر، حوصلے اور استقامت کی ضرورت ہے۔

میری رائے میں اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے خطیبِ محترم سے تعبیر میں کچھ لغزش ہوئی ہے۔ اہلِ علم کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ حدیث بدءِ وحی کا تعلق تعلیم و تربیتِ اطفال سے نہیں ہے۔ یہ تو جبریل امین اور حضور سید انبیاء کا معاملہ ہے۔ نہ جبریل انسانی معلم تھے اور نہ ہمارے حضور ﷺ بچے تھے۔ اس بنیاد پر اگر کوئی بچوں کو مارنے، تکلیف دینے یا ان کی تادیب پر اس حدیث سے استدلال کرے تو یہ علمی اصول استدلال کے خلاف ہے۔ اس باب میں استدلال اُن صحیح نصوص سے کیا جائے گا جو براہِ راست تربیتِ اطفال پر وارد ہوئی ہیں، جیسے نماز کی تعلیم اور دس برس کی عمر میں تادیب سے متعلق احادیث۔ یہی طرز علمی دیانت اور اصولِ استنباط کے مطابق ہے۔

لہٰذا جبریلِ امین اور سید الانبیاء ﷺ کے مابین وحی کی ابتدائی کیفیت کو بچوں کی تعلیم و تربیت یا انہیں اذیت پہنچانے پر منطبق کرنا محلِ نظر ہے، بلکہ علمی قواعد کے منافی ہے۔ اس واقعے کا من جملہ پیغام یہ ہے کہ دین کے علم کا حصول قربانی، صبر اور محنت کے بغیر ممکن نہیں۔

البتہ حصولِ علم کی راہ میں تحملِ مشقت کے لیے اس واقعے سے فی الجملہ استدلال کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اسے بچوں کو تکلیف دینے یا مارنے پر دلیل بنانا کسی طور درست نہیں۔ واللہ أعلم بالصواب

ایک سرسری تعارض کا جواب

سوال: اکثر حدیث کے حوالے یہ بات دلوں کو اطمینان بخشنے کے لیے کی جاتی ہے کہ نبی ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ "مجھے یہ کیسے احساس ہو کہ جو نماز میں پڑھتا ہوں وہ قبول ہو جاتی ہے" تو اسکے جواب میں فرمایا کہ ایک نماز کے بعد اگر دوسری کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لینا کے پہلے والی قبول ہوگئی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہے۔

ایک دوسری جگہ حدیث کے حوالے سے یہ بحث کی جاتی ہے کہ کل قیامت کے دن وہ نمازیں جو اسکی معیار کے مطابق ادا نہیں کی گئیں وہ نمازیں پرانے بُوسیدہ کپڑے میں لپیٹ کر اس شخص کے چہرے پر مار دی جائیں گی (یعنی کے قبول نہیں ہوئی) اب سب سے پہلے تو مجھے یہ جاننا ہے کہ یہ سچ میں حدیث ہے اور اگر ہے تو یہ متضاد کیوں ہیں۔

دوسری حدیث سے یہ واضح ہوگیا کہ وہ بندہ نمازی تھا کیوں کہ لفظ نمازیں استعمال ہوا ہے اور پہلی حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اسکی پہلی نماز قبول ہو رہی تھی تبھی اسکو دوسری کی توفیق ہو رہی تھی۔ اب سمجھنا یہ ہے کہ وو کونسی نمازیں ہوں گی جو اسکے چہرے پر ماری جائیں گی۔

جواب: دنیا میں نیک اعمال بشمول نماز کی قبولیت کا یقینی علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی شریعت نے ہمیں اس کا مکلف بنایا ہے کہ ہم اس کی تحقیق میں پڑیں۔ البتہ علماء کرام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں چند علامتیں ذکر فرمائی ہیں جو یقینی نہیں ہیں جن کا خیال رکھنے سے اعمال کی قبولیت کی صرف امید کی جاسکتی ہے۔

ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ "ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی توفیق ہونا پہلی نماز کی قبولیت کی علامت ہے"۔ لیکن یہ کوئی حدیث نہیں ہے، لہٰذا اسے حدیث کہہ کر بیان کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ "ایک نیک عمل کے بعد دوبارہ اسی نیک عمل کی توفیق ہوجانا پہلے عمل کی قبولیت کی علامت ہے" یہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

(اصلاحی مجالس: ۱۵/ ۳۱۴، از: حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا ہے وہ ایک علامت ہے اس سے فقط اس وقت قبولیت کی امید کی جاسکتی ہے جب نماز کو تمام شرائط کے ساتھ اچھے سے ادا کیا ہو، ضائع نہ کیا ہو۔ اگر نماز کو شرائط کی رعایت نہ کر کے ضائع کر دیا تو باوجود دوبارہ نماز کی توفیق مل جانے کے

نماز قبول نہیں ہوگی، بلکہ اس کے منہ پر ماردی جائے گی، جیسا کہ اس حدیث شریف میں ہے؛
اور جو شخص نماز کو بری طرح سے پڑھے (وقت کو بھی ٹال دے) وضو بھی اچھی طرح نہ کرے رکوع سجدہ بھی اچھی طرح نہ کرے تو وہ نماز بد دعاء دیتی ہوئی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے بھی ایسا ہی برباد کرے جیسا تو نے مجھے ضائع کیا، اس کے بعد وہ نماز پرانے کپڑے کی طرح سے لپیٹ کر نمازی کے منہ پر ماردی جاتی ہے"۔ (رواہ الطبرانی)

———

نفلی حج یا غریبوں کی امداد

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ امیر اور مالدار لوگ نفلی حج کی کثرت کرتے ہیں اور لوگوں کی نہ مدد کرتے ہیں نہ بے نکاحوں کے نکاح کراتے ہیں، بعضے یہ بھی کہتے ہیں نفلی حج عمرہ ترک کردو اس وجہ سے اس کی رقم سعودیہ کے پاس جاتی ہے اور وہ اسرائیل کی در پردہ امداد کرتا ہے۔

جواب: یہ بات نہ عقل میں آنے والی ہے، نہ اس کا کوئی ٹھک ہے۔ کیوں کہ جب خطاب امیروں کو ہے تو امیر شخص تو دونوں کار خیر انجام دے سکتا ہے پھر عمرہ یا حج ترک کرانے کی ضرورت کیوں پیش آئی، جمہور نے کثرت عمرہ کو مستحب بتایا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک سال میں دو تین عمرہ کرنا ثابت ہے، جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا انصار کی بچیوں کی پرورش کرکے ان کی رخصتی بھی کیا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں شادی کرانے کا کیا خرچ ہوتا ہے؟ لڑکی کا اور شادی کا برکتی ہونا تو کم خرچ والے نکاح میں ہے۔ ایسا نکاح پانچ سو روپے میں بھی ہوسکتا ہے۔

لڑکے کی شادی کرائیں کا کیا مطلب؟ جب بالغ ہوگیا تو مہر نفقہ خود اٹھائے گا ورنہ روزہ رکھنے کا حکم ہے، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر میں تخفیف کراکے نعلین وغیرہ پر نکاح کرایا ہے لیکن شوہر کے نفقہ کا ذمہ نہیں لیا، اگرچہ جب فراوانی ہوئی تو مقروض کے قرض کی ادائیگی اور نادار یتیم کی کفالت اپنے ذمہ لی تھی۔ البتہ ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال فئی آتا تو آپ اس کو اسی دن ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم فرمادیتے تھے جو بیوی والا ہوتا تو اس کو دو حصے دیتے اور مجرد کو ایک حصہ عطا فرماتے چنانچہ ایک مرتبہ مجھ کو بھی بلایا اور آپ نے مجھے دو حصے عطا فرمائے کیونکہ میری بیوی تھی اور پھر میرے بعد عمار بن یاسر کو بلایا گیا جن کی بیوی نہیں تھی ان کو آپ نے ایک حصہ دیا۔

{جَعَلَ اللهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِلنَّاسِ }يَقومُ بِالقِيامِ بِتَعظيمِهِ دِينُهُم وَدُنياهُم، فَبِذلكَ يَتِمُّ إِسلامُهُم، وبِهِ تُحَطُّ أَوزارُهُم، وتَحصُلُ لَهُم ... - بِقَصدِهِ العَطَايَا الجَزِيلَةُ، وَالإِحسَانُ الكَثِيرُ، وَبِسَبَبِهِ تُنفَقُ الأَمْوَالُ، وَتَتَقَحَّمُ - مِنْ أَجْلِهِ - الأَهْوَالُ. وَيَجْتَمِعُ فِيهِ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ جَمِيعُ أَجْنَاسِ المُسْلِمِينَ، فَيَتَعَارَفُونَ وَيَسْتَعِينُ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ، وَيَتَشَاوَرُونَ عَلَى المَصَالِحِ العَامَّةِ، وَتَنْعَقِدُ بَيْنَهُمُ الرَّوَابِطُ فِي مَصَالِحِهِم

الدِّينِيَّةِ وَالدُّنيَوِيَّةِ. قَالَ تَعَالَى: {لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الأَنْعَامِ}. وَمِنْ أَجْلِ كَوْنِ البَيْتِ قِيَامًا لِلنَّاسِ قَالَ مَنْ قَالَ مِنَ العُلَمَاءِ: إِنَّ حَجَّ بَيْتِ اللهِ فَرْضُ كِفَايَةٍ فِي كُلِّ سَنَةٍ. فَلَوْ تَرَكَ النَّاسُ حَجَّهُ لَأَثِمَ كُلُّ قَادِرٍ، بَلْ لَوْ تَرَكُوا حَجَّهُ لَزَالَ مَا بِهِ قِوَامُهُمْ، وَقَامَتِ القِيَامَةُ. (تفسیر السعدی)

ترجمہ: ”اللہ نے کعبہ، جو حرمت والا گھر ہے، لوگوں کے دین و دنیا کے قائم ہونے کا سبب بنایا ہے۔ لوگ اس کی تعظیم کے ذریعے اپنے دین و دنیا کی بھلائیاں حاصل کرتے ہیں۔ اسی کے ذریعے ان کا اسلام مکمل ہوتا ہے، انہی عبادات سے ان کے گناہ مٹائے جاتے ہیں، اور اس کا قصد کرنے والوں کو بڑی بڑی عطائیں، وسیع احسانات اور بے شمار برکتیں نصیب ہوتی ہیں۔ اسی کی خاطر اموال خرچ کیے جاتے ہیں، اسی کے لئے سختیاں برداشت کی جاتی ہیں۔ اور اس گھر میں ہر دور دراز راستے سے مختلف نسلوں اور قوموں کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے تعارف کرتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد لیتے ہیں، عام دینی و دنیاوی مصلحتوں پر مشورہ کرتے ہیں، اور ان کے درمیان دینی و دنیوی مفادات کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تا کہ وہ اپنے فائدے کی چیزیں وہاں دیکھ لیں، اور مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں اس پر جو جانور اللہ نے انہیں عطا کیے ہیں۔“ اور چونکہ یہ گھر لوگوں کے دین و دنیا کا قائم رہنے کا سبب ہے، اسی لیے بعض علما نے کہا ہے کہ اللہ کے گھر کا حج ہر سال فرضِ کفایہ ہے۔ اگر لوگ حج کو پوری طرح چھوڑ دیں تو ہر صاحبِ قدرت گناہگار ہوگا، بلکہ اگر وہ حج چھوڑ دیں تو ان کے دین و دنیا کا نظام ٹوٹ جائے اور قیامت قائم ہو جائے۔“

اوپر والی تفسیری عبارت بغور پڑھیے، کعبہ کو قوام الدین و الدنیا کہا گیا ہے، کچھ تو خاص ہے کعبہ میں کہ اول دن سے اس کے قصد کرنے کا حکم دیا گیا اور اس کو قیاما للناس قرار دیا۔

اپنے شیخ سے سنا ہے قرآن میں دو ہی چیزوں کو قیاما للناس قرار دیا گیا ہے ایک مال کو اور ایک کعبہ کو۔ مال نہ ہو تو بھی لوگوں کا قیام نہیں ہوسکتا، کعبہ (یا کعبہ کی طرف قصد و ارادہ) نہ ہو تو بھی لوگوں کا قیام نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ جب قربِ قیامت کعبہ منہدم کر دیا

جائے گا تو لوگوں کا بقا دشوار ہو جائے گا اور قیامت آ جائے گی۔

ذرا سوچو جو لوگ امت کے نجات دہندہ کو تلاش کریں گے اور حضرت مہدی کو پہنچانیں گے وہ بھی دور دراز کے آئے ہوئے اولیاء ہی پہچانیں گے۔ (یہاں آنا تو کبھی نہ بند ہوا ہے نہ ہوگا)

حضرت نبی کریم ﷺ نے اپنے دو عمرے اس وقت فرمائے، جب مشرکوں کا راج مکہ پر تھا، وہاں پر کیے جانے والے خرچے مشرکوں کے ہاتھ آتے تھے۔ پہلے عمرے کو جب مشرکوں نے روکا تو ان کو قرآن میں سب سے بڑا ظالم کہا گیا۔

———————

تراویح کی اجرت

سوال: ایک مولانا صاحب نے تراویح کی اجرت کو جائز قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا'' (آپ کہہ دیجیے کہ میں تم لوگوں سے کسی اجر کا سوال نہیں کرتا) یہ آپ غیروں کو کہا ہے، یہ خطاب ابوجہل کو تھا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نہیں۔ اور علماء جو تقاضا کرتے ہیں وہ اپنوں سے کرتے ہیں۔ لہٰذا اپنوں سے اجرت لینا دینا جائز ہے۔

جواب: مولانا محترم کی یہ دلیل خطابی تو ہوسکتی ہے یعنی عوام کے لیے تسلی بخش مسکت و مفید، لیکن برہانی نہیں۔ دلیل میں کمزوری ہے؛

اس لیے کہ ''قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا'' میں ادائے رسالت پر اجر معاوضہ نہ طلب کرنا بتایا گیا ہے۔ اور جہاں آپ نے مطالبہ کیا ہے وہ ادائے جہاد یا قضائے حق غیر کے لیے کیا ہے اور وہ اجر و معاوضہ نہیں بلکہ مسلمانوں پر حق ہے جیسے حدیث شریف میں ہے ''إِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ''۔ ترجمہ: مال میں زکات کے علاوہ بھی حق ہے۔ (ترمذی)

آپ نے اپنے لیے اس وقت بھی مطالبہ نہیں کیا جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت کے موقع پر سواری لے کر آئے تھے، اور ہدیہ دینا چاہا تھا لیکن آپ نے بیع تولیہ فرمایا۔ اپنی ذات کے لیے اس وقت بھی آپ نے مطالبہ نہیں کیا تھا جب وفات سے قبل اپنی محبوب چیز آلۂ جہاد ''لوہے کا جیکٹ'' گروی رکھنے کی نوبت آ گئی تھی۔

آپ کے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا محبوب بیوی فاقہ کرتی لیکن آپ نے اپنی ذات اور اپنے آل کے لیے مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ جب آپ کے پاس مال کی فراوانی ہوئی تو آپ نے فرمایا: أنا أولى بكلِّ مسلمٍ من نفسِه من ترك مالًا فلورثته ومن ترك دينًا أو ضياعًا الي.

''میں ہر مسلمان کی جان سے زیادہ اس کے قریب اور اس کا حق دار ہوں۔ جس نے مال چھوڑا، وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے، اور جس نے کوئی قرض یا عیال (بچے، خاندان) چھوڑے ہوں تو وہ میرے ذمہ ہیں۔''

مقصد دلیل کی کمزوری بتانا ہے، جو لیتے ہیں ان کو روکنا مقصود نہیں ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر اور شیوا وسنبھا

۲۰۲۴ء میں چھاوا نامی ایک فلم آئی تھی، جس میں اورنگ زیب عالم گیر کے کردار کو داغ دار کیا گیا اور اس کے مقابل سنبھا کو با کمال اور بہادر قومی ہیرو کی طرح آشکارا کیا گیا۔ لوگوں میں ناواقفیت کی وجہ سے بے چینی ہوئی اور باتوں کو تہہ تک رسائی کی چاہت ہوئی تو اس وقت مندرجہ ذیل تحریر لکھی گئی۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ

شاہ جہاں کی محبوب ترین بیگم ممتاز محل سے چودہ اولاد تھیں، جن میں سے سات زندہ رہیں، دارشکوہ سب سے بڑا تھا اورنگ زیب کا نمبر ساتواں تھا۔

شاہ جہاں کا داد ''اکبر'' لامذہب تھا، اس کا بیٹا ''جہاں گیر'' مذہبیت اور لامذہبیت میں متوسط تھا اور اب شاہ جہاں کی باری تھی جو حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے خلفاء کی محنت سے اچھا خاصا دیندار تھا رعایا خوش حال تھی اور اپنے عدالتی، اقتصادی، معاشی و مذہبی معاملات اور نظم و انصرام میں بادشاہ سے خوش تھی۔

سید محمد میاں لکھتے ہیں: فہم و تدبر، رحم و کرم، عدل و انصاف، غرباء پروری علم دوستی، متانت اور سنجیدگی وغیرہ وغیرہ شاہجہاں کے وہ اوصاف ہیں جن میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس کی تہذیب اور متانت کا یہ حال تھا کہ ناشائستہ کلمات سے اس کی زبان ہمیشہ پاک رہی۔

حلم و بردباری اور حسن اخلاق یہ کہ وہ اپنی مجلس میں خطاوار کے متعلق بھی حتی الوسع ایسے کلمات سے احتیاط کرتا جن سے اس کو شرمندگی ہو۔ وہ بہادر تھا اور بہادری میں اپنے دادا بابر کی یادگار تھا۔ مگر بے نظیر شجاعت کے باوجود حد سے زیادہ رحم دل اور نوع انساں کا ہمدرد۔

شاہجہاں کہا کرتا تھا کہ شاہی خزانے صرف اس لئے ہیں کہ باشندگان ملک کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ بادشاہ ان کے صرف امانت دار ہیں۔

اخلاق و اوصاف: شاہجہاں کے متعلق تاریخ کی مبسوط تحریروں کے بجائے سلطان عالم گیر کے صرف ایک رقعہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ جو عالمگیر نے شاہزادہ محمد اعظم کے نام لکھا ہے: اعلیٰ حضرت (شاہ جہاں) فرمایا کرتے تھے۔ شکار بے کاروں کا کام ہے۔ انسان اگر امور

آخرت میں مشغول نہ ہو، تو دنیاوی کاموں کو درست کرنے ہی میں کیا خرابی ہے۔ آخر دنیا کو آخرت کی کھیتی بتایا گیا ہے۔

اس نے اپنے جلوس کے پہلے سال ہی سجدۂ سلامی کی ممانعت کر دی۔ زمین بوسی کا طریقہ رائج تھا۔ پھر ۱۰۴۶ھ میں اس کو بھی منسوخ کر دیا کہ اس میں بھی انسان کے سامنے سجدہ کی مشابہت ہے۔ درشن کا دستور جو اکبر کا ایجاد کردہ تھا، بحالہ باقی رہا۔

شیعوں کے رسوخ کے باعث صحابہ کرام بالخصوص خلفاء راشدین کے ذکرِ خیر پر جو اثر پڑ سکتا تھا محتاج بیان نہیں۔ دکن کے شیعہ فرمانرواؤں کے قلمرو میں آئے دن خطبہ میں خلفاء راشدین کے ذکر پر پابندیاں عائد ہوتی رہتی تھیں۔شاہجہاں نے ان ریاستوں سے صلح کی پہلی شرط یہی رکھی کہ شتم صحابہ نہ کیا جائے۔ مدح صحابہ پر پابندی نہ عائد کی جائے۔

۱۰۴۳ھ میں جب شاہ جہاں سیر کے لئے کشمیر گیا تھا تو معلوم ہوا کہ مسلمان احکام وتعلیمات اسلام سے ناواقف ہیں۔ ہندوؤں میں بیاہ شادیاں ہوتی ہیں۔ ہندو لڑکی کو مرنے کے بعد مسلمان زمین میں گاڑتے ہیں اور مسلمان لڑکی کو ہندو جلاتے ہیں۔ شاہجہاں نے حکم دیا کہ جو مسلمان لڑکی ہندو کے گھر میں ہو، اگر اس کا شوہر مسلمان ہو جائے، تو از سر نو نکاح کرایا جائے۔ ورنہ مسلمان لڑکی کو علیحدہ کر لیا جائے۔ اس کے بعد قاضی اور معلم مقرر کر دیئے اور ان کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کر دیا۔

شاہ جہاں کے دن رات کی مشغولی اور معمول لکھنے کے بعد اور شہزادی جہاں آرا بیگم (دختر شاہ جہاں) کی زبانی بادشاہ اور اس کی حکومت کا نقشہ کھینچ کر سید محمد میاں لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے انسان کو باخدا اور ولی اللہ کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔

نیز لکھتے ہیں: حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مطالبات پر نظر ڈالیے، اور پھر جہاں آرا کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ کامیاب تحریک کا کس قدر مبارک منظر سامنے آئے گا۔

(علمائے ہند کا شاندار ماضی ۱/ ۲۶۴)

شاہ جہاں کی کمزوریاں: شاہجہاں کو سماع سے بھی شوق تھا اور یہ اس چشتیت کا باقی ماندہ اثر تھا جو اکبر کے زمانہ سے اس خاندان میں چلی آرہی تھی۔ خاص خاص مواقع پر میلاد شریف بھی کرایا کرتا تھا۔ قبروں اور مزارات کو پختہ بنانے کا طرز اس کے آباواجداد سے چلا آرہا تھا۔ مقبرات

کے متعلق اُس کے حسن و ذوق نے اس کے مقبرہ کو تاج محل کی شکل دیدی جو دنیا کی تعمیرات میں بے نظیر ثابت ہوئی۔ بائیس سال متواتر شب و روز انتھک کام کرنے کے باعث مزاج میں تیزی بھی پیدا ہوگئی تھی۔

جب عالمگیر کی برائی اس کے ذہن میں بٹھادی گئی تو وہ دن بدن ترقی ہی کرتی رہی۔ عالمگیر نے جب بھی معذرت کی وہ عموماً نامنظور ہوئی، اس کے جواب میں کوئی اور نکتہ چینی کر دی گئی۔

سلاطین ایشیا کا عام نظریہ یہ ہے کہ ''الملک عقیم'' یعنی بادشاہ کے اولاد نہیں ہوتی۔ جہانگیر کا مقولہ تھا کہ ''بادشاہ عزیزی و قرابتے ندارد۔'' چنانچہ جہاں گیر اپنے عزیز واقارب سے بھی وہی احتیاط برتا جو غیروں سے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

لیکن اس کے برخلاف شاہجہاں کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کو اپنی اولاد اور اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت تھی۔ داراشکوہ سب سے بڑا لڑکا ہے، جو دو بہنوں کے بعد پیدا ہوا۔ سب سے بڑی بہن کا انتقال شیر خوارگی میں ہوگیا تھا۔ دارا اور اس کی بڑی بہن جہاں آرا بیگم لاڈ پیار کے پلے ہوئے تھے۔

شاہجہاں کو دارا اور جہاں آرا بیگم سے جو محبت تھی اس کو عشق کے درجہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دارا باپ کی اس محبت کے سبب سے بدقسمتی کا شکار ہوگیا۔ باپ نے اس کو جاگیریں بڑی بڑی دیں۔ مگر انتظام کارندوں کے ہاتھ میں رہا۔ دارا ہمیشہ شاہجہاں کے ساتھ رہا۔ اپنی جاگیروں میں جانے اور نظام حکومت سنبھالنے کا اُسے موقعہ ہی نہ ملا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حکومت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا۔ وہ امراء کے حق میں بدخلق اور گستاخ ہو گیا۔ (ایضا) یہی محبت شاہ جہاں کی بھی کمزوری واقع ہوئی (جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا)

داراشکوہ:

داراشکوہ کو عربی فارسی زبان پر مثل اہل زبان کے عبور تھا۔ سنسکرت کی تعلیم بنارس میں رہ کر پنڈتوں سے حاصل کی تھی۔ تصوف سے بھی اُسے خاص ذوق تھا۔

بیشک اس کو ہر قسم کی ترقی کے لئے قدرت نے بہترین موقع عطا فرمایا تھا۔ مگر اس کی فطری خود پسندی نے اس کو غلط راستہ پر لگا کر اسلام کی جگہ الحاد کا حامی بنا دیا۔ اس کی تصانیف کی ترتیب صاف طور پر بتاتی ہے کہ وہ کس طرح آہستہ آہستہ زندقہ اور الحاد کی طرف جارہا ہے۔

ہندوؤں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اُس نے اپنی ایک کتاب لکھی جو مجمع البحرین کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دارا کی آخری تصنیف ہے جو اس کے عقائد و خیالات کو عریاں کر کے سامنے لاتی ہے۔ یہ ۱۰۶۵ھ میں لکھی گئی۔

اس کتاب میں دارا نے یہ دکھایا ہے کہ اسلامی تصوف اور ویدانتک فلسفہ اپنے اصول، اپنی تعلیمات اور اپنی حقانیت کے لحاظ سے ایک ہیں، اور جو شخص حق کو حاصل کرنا چاہے وہ ان میں سے کسی بھی راستہ کو اختیار کرے، اس سے منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اُسے خود خطرہ تھا کہ مسلمان اس کی تصنیف کو پسند نہ کریں گے۔ اس لئے اُس نے دیباچہ میں لکھ دیا کہ اُس نے یہ کتاب راز درونِ خانہ سے واقف اہل بیت کے لئے لکھی ہے۔

وہ اپنے گمان میں خود کو حکومت و بادشاہت کا سب سے زیادہ حقدار سمجھنے لگا تھا، اور ہندو اور شیعہ بھی اس کو مثل اکبر دیکھ کر اسی کے ہمنوا تھے اور آئندہ اسی کو بادشاہ دیکھنا چاہتے تھے یہ لوگ شاہ جہاں کی مذہب پسندی اور احکام اسلام کی پیروی سے بیزار ہو گئے تھے۔

دارا کے دل میں بھی حکومت کی شدید طلب تھی اور اس سلسلے میں اس نے کافی پلاننگ کر لی تھی اور اس کے دل میں بالخصوص اورنگ زیب سے متعلق پرخاش تھی جو دن بدن بڑھتی گئی۔

سید محمد میاں لکھتے ہیں: دارا شکوہ، شاہجہاں کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس لئے سب سے زیادہ پیارا تھا ماں باپ کے لاڈ پیار، درباریوں کی خوشامد، غلط تعریف اور خود شاہجہاں کی انتہائی محبت نے اُسے خودسر، خود رائے اور ستایش پسند بنا دیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ تمام حکومت میں اس سے زیادہ صائب الرائے، ہوش مند، وسیع المشرب اور صاحب اقتدار کوئی نہیں ہے اس لئے جب اس کے دوسرے بھائی سن شعور کو پہنچے اور اپنے درجہ، مرتبہ اور کاموں کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے تو اُسے یہ بات نہایت ناگوار معلوم ہوئی، اور چونکہ اورنگ زیب ان میں سب سے زیادہ بااثر، عقل مند، دور اندیش اور سب سے زیادہ کامیاب تھا، اس لئے دارا کو اس سے خواہ مخواہ عداوت پیدا ہو گئی، اور جوں جوں اورنگ زیب ترقی کرتا، اور لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا جاتا، دارا کی دشمنی اور اس کی سازشیں، اس کے خلاف بڑھتی جاتیں۔ (ایضا)

شاہجہاں کے آخری عہد میں کچھ یوں ہوا کہ جب وہ طویل علالت کے باعث حکومتی ذمہ داریوں سے بیٹھ گیا تو یہی دارا شاہجہاں کے نام پر حکومت کرتا تھا۔ اور اسے کاروبار حکومت سے

بالکل معطل کر دیا تھا۔ علاوہ اس کے دارا شکوہ نے شاہجہان کے خط اور دستخط کی نقل میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ اصل کا گماں ہوتا تھا۔ وہ شاہجہان کے نام سے احکام صادر کرتا تھا جن کی اسے مطلق خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ اس کے تینوں بھائی صحیح صورت حال سے مطلع کرنے کے لیے شاہجہاں کے نام جو خط لکھتے ہے دارا انہیں شاہجہان تک پہنچنے ہی نہیں دیتا تھا۔مزید بر آں اسی زمانہ اقتدار میں اس نے ہندوؤں کی بے حد طرفداری کی۔بعض مقامات پر ان کی اس حد تک طرفداری کی کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہ کیا مسجدوں اور بزرگان دین کے مقبروں کو بے دریغ ڈھا دیا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ خود شاہجہان نے بھی اپنی بیماری کے باعث کاروبار حکومت دارا شکوہ پر چھوڑ دیا تھا۔ اور خود کو اپنی دانست میں معذور اور گوشہ نشین سمجھ لیا لیکن درحقیقت وہ دارا شکوہ کی قید میں تھا اور نظر بند تھا۔ مگر بایں ہمہ اس کی ذاتی خدمتوں اور پیارا ہونے کے باعث اس پر مہربان تھا۔ اس نے اسے پہلے ہی سے اپنا جانشین مقرر کر رکھا تھا اب جب کہ طویل بیماری کے باعث ہاتھ پیر چلنے سے رہ گئے تو اسے اب اپنا نائب سمجھ لیا۔

اگر قسمت نے اورنگ زیب کی یاوری نہ کی ہوتی اور دارا شکوہ ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک بن جاتا تو وہ یقیناً اکبر اعظم کے دین الٰہی کو زندہ کرتا جس سے ہندوستان کے اکثر لوگ نہ ہندو رہتے نہ مسلمان۔ خاص کر مسلمانوں کے لیے تو دین الٰہی سم قاتل ثابت ہوتا۔غرض دارا شکوہ کے ملحدانہ خیالات جو اس کی تصانیف سے ظاہر ہوتے ہیں، اسے ہندوستان کا اکبر ثانی ثابت کرتے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے وجود کو مٹا کر ہندوستان کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کی بھر پور کوشش کی۔

سعدی لکھتے ہیں: ہمارے نزدیک اورنگ زیب نے دارا سے جو لڑائی لڑی وہ شخص واحد کی لڑائی نہ تھی۔ وہ اس جماعت کی لڑائی تھی جو اسلام کو دین حق سمجھتی تھی اور اسے رائج اور نافذ کرنے کی آرزومند تھی۔ یہ اس گروہ کی لڑائی تھی جسے اکبر نے ناکام رکھا۔ اور اس نے اورنگ زیب کا سہارا لے کر دارا سے اکبر کا انتقام لینا چاہا تھا۔ (محی الدین اورنگ زیب عالمگیر)

اورنگزیب عالمگیر کا حقیقت میں یہی سب سے بڑا زریں کارنامہ ہے یا یوں کہہ لیجیے ہندوؤں اور انگریزوں کے نزدیک سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اُس نے دارا شکوہ کو شکست دے کر

حکومت پر تسلط جمایا اور اپنی اصلاحات جاری کر کے اکبر کے فتنہ دین الٰہی کو ازسر نو زندہ کئے جانے کے تمام امکانات کو یکسر مٹا دیا۔ اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی، حضرت مجدد الف ثانی اور انکے خلفاء کی محنتوں کو ضائع ہونے سے بچا لیا اور ہندوستان میں طرز خلافت پر ایک اسلامی حکومت قائم کر کے ہندوؤں راجپوتوں برہمنوں کے خواب کو دارا کی شکست سے چکنا چور کر دیا، اسلامی احکام نافذ کرنے میں کسی طاقت بغاوت مذہب مسلک کی پرواہ نہیں کی۔

اور ہندوانہ نشان وعلم کے ساتھ ابھرنے والی طاقت مراٹھوں کو جہاں سے آئے وہیں پہنچا کر دم لیا؛ چھیاسی برس کی عمر میں اس جواں حوصلہ بلند ہمت بادشاہ نے ان اسلام دشمنوں کے خلاف لشکر کشی کی اور بذات خود کمان لی، اور بالآخر تمام قلعے ایک ایک کر کے فتح کر لیے، الفنسٹن صاحب نہایت ناگواری اور مجبوری سے شہادت دیتے ہیں:

اورنگ زیب اپنی چال چل گیا یہاں تک کہ چار سال میں سارے بڑے بڑے قلعوں کو اپنے تصرف میں لایا، بہت سے معرکے لمبے چوڑے اور خونوں کے پیاسے واقع ہوئے اور دونوں طرف طرح طرح کی تدبیریں برتی گئیں مگر وہ تدبیر ایسی مرۃ بعد اخروی ہوئی کہ تفصیل ان کی نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے، ہاں انجام ان کا یہ ہوا کہ قلعے تمام فتح کر لیے گئے۔

راج گڑھ کا قلعہ جو شیواجی کا گویا پائے تخت تھا اس کا دور بارہ میل کا تھا راستے ہی اس قدر دشوار گزار تھے کہ کئی کئی دن کے متواتر سفر میں ایک ایک کوس طے ہوتا تھا۔

لین پول صاحب مصائب راہ کے متعلق لکھتے ہیں: کوچ کی حالت میں ناممکن العبور دریاؤں سیلابی وادیوں پر نالوں اور تنگ راستوں نے کس قدر تکلیف دی ہوگی جہاں سامان رسد مہیا نہ ہوتا تھا اور چارہ گھانس کے نہ ملنے سے جانورانِ بار برداری کی یہ حالت ہو جاتی تھی کہ فوج بے دست و پا ہو جاتی تھی۔ برسات کے سوا گرمیوں میں منزلوں کی سختی خیموں کی اذیت اور پانی نہ ملنے کی مصیبت بیان سے باہر ہے۔

عالمگیر کی وفات سے دو برس پہلے مرٹھوں کے تمام قلعے اور محفوظ مقامات فتح ہو گئے، عالمگیر نے حسین قلی خان کو متعین کیا کہ تمام ملک میں امن و امان کی منادی کرا دے اور رعایہ کو ترغیب دے کہ اپنے اپنے گھر پر آباد ہو جائیں۔

مراٹھے اب بالکل بے خانماں ہو گئے تھے، خانہ بدوش ہو کر ادھر ادھر قزاقوں اور ڈاکوؤں

کی طرح چھاپے مارتے پھرتے۔

مراٹھے شاہ جہاں کے آخری اور عالم گیر کے شروع زمانے میں پوری قوت حاصل کر چکے تھے ۔ دکن سے مدراس تک پھیل گئے تھے۔سینکڑوں نہایت مضبوط اور سر بفلک قلعے ان کے قبضے میں تھے ان سب باتوں کے علاوہ وہ ایک زندہ قوم بن رہے تھے اور یہ اس کا عین عروج شباب تھا۔ اسی حالت میں عالمگیر کو ان سے مقابلہ کرنا پڑا اب دیکھو نتیجہ کیا ہوا؟ یہ ہوا ہے کہ عالمگیر کے جیتے جی سیوا مر گیا۔ سمبھا مارا گیا۔ رام راجا آوارگی اور صحرانوردی کی نذر ہوا۔سنتا کا سر کاٹ کر دربار میں پہنچا۔غرض علم برادران بغاوت ایک ایک کر کے مارے گئے تمام قلعہ جات پر قبضہ کرلیا گیا اور دکن سے لیکر مدراس تک سناٹا ہو گیا ہے

ہیچ خار نیست کزخون شکارے سرخ نیست آ فتے بود آن شکار افگن گزیں صحرا گذشت

اب مراٹھے کوئی حکومت یا کوئی قوم نہ تھے بلکہ خانہ بدوش راہزن تھے جو ادھر ادھر آوارہ پھرتے تھے اور موقع پا کر چوری چھپے لوٹ مار کرتے تھے ۔ (اورنگزیب عالمگیر ایک نظر میں)

قصہ مختصر یہ کہ ان لوگوں کے نزدیک آج بھی اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ راسخ العقیدہ سچا مسلمان تھا خود اسلام کی پیروی اور ملک کا بھی اسلام کے مطابق انتظام کرتا جس سے ملک سونے کی چڑیا تھی اور رعایا خوش حال تھے۔

سید محمد میاں لکھتے ہیں: مغل سلاطین کے عروج کا زمانہ ہندوستان کی خوشحالی کا بہترین دور تھا۔ اس دور میں ہندستان کا خطاب جنت نشان تھا اور اس کو سونے کی چڑیا اور باغ ارم مانا جاتا تھا۔ اس دور میں ناممکن تھا کہ کوئی ہندستانی بھوکا ننگا ہو۔ (ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں)

دوسری غلطی اورنگ زیب عالمگیر کی یہ تھی کہ اس کے جتنے بھی تاریخ لکھنے والے ہیں وہ یا تو ہنود و انگریز ہیں یا شیعہ شنیعہ ، جنھوں نے اس کے دور امارت کو جو مثل علی نہج الخلافت تھا حقیقت سے اوجھل کر کے رکھ دیا اور مذہبی تشدد کے ایسے واقعات گھڑے یا ان کی ایسی غلط تشریح کی کہ وہ آنے والے برادران وطن کے لیے قابل نفرین یا کم از کم ناقابل تقلید رہ گئے۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں: عالمگیر کو اگرچہ خلافت کا دعوے نہ تھا تاہم وہ مسلمان بادشاہ تھا اور اس کا فرض تھا کہ وہ حکومت میں اس قدر اسلامی شان باقی رکھے جس قدر ایک اسلامی حکومت کے لئے اصل عنصر کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اکبر نے جس رنگ میں سلطنت کو رنگنا شروع کیا

تھا اور جس کی یادگاریں شاہ جہاں کے زمانہ تک بھی آتی تھیں وہ اگر قائم رہتا تو تیموری سلطنت ایک ہندو بن چکی ہوتی۔ اس وقت اسلامی شعار بالکل لٹ گئے تھے عام دربار کا لباس گھیر دار پاجامہ اور ہندوانی پگڑی تھی۔ راجاؤں کی طرح سلاطین زیور پہنتے تھے۔ دربار میں سلام وغیرہ کے بجائے سجدہ ماتھا ٹیکی رائج تھی۔ بے غیرتی اس قدر بڑھی کہ بے غیرت مسلمانوں نے ہندوں کو لڑکیاں دینی شروع کیں۔ عالمگیر نے عنان سلطنت ہاتھ میں لی تو اس کا یہ فرض تھا کہ اسلامی شعائر دوبارہ قائم کرے۔ (اورنگزیب عالمگیر ایک نظر میں:۹۶)

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی بیویاں اور اولاد

بیویاں: (۱) ملکہ نواب بائی۔ (۲) دل رس بانو بیگم دختر شاہ نواز خان صفوی۔ (۳) بائی اودے پوری۔ (۴) اورنگ آباد محل بیگم۔

آپ کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ آپ نے ان سب کی تعلیم وتربیت بڑے اہتمام سے کی، تمام شاہزادے قرآن حکیم کے حافظ، اور علوم دینی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ نیز ترکی و فارسی زبان بھی انہیں خوب آتی تھی ان زبانوں میں تقریر وتحریر پر مہارت رکھتے تھے۔

شاہزادیاں بھی تلاوت وکتابت قرآن حکیم میں دن رات مشغول رہتیں۔ نہایت پابند صوم وصلوۃ تھیں۔ اور دین کے احکام کی واقفیت رکھتی تھیں۔

بیٹے: (۱) محمد سلطان والد کی زندگی میں وفات پائی۔ (۲) محمد معظم عالم شاہ۔ (۳) محمد اعظم شاہ عالی، اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بادشاہ ہوئے۔ (۴) محمد اکبر۔ (۵) محمد کام بخش۔

بیٹیوں کے نام یہ ہیں: (۱) زیب النساء بیگم قرآن مجید کی حافظہ تھیں۔ عالمگیر نے اسے تیس ہزار اشرفیاں قرآن حکیم حفظ کرنے کی خوشی میں بطور انعام عطا کیں۔ اس شاہزادی کے حکم سے ملا صفی الدین نے قرآن حکیم کی تفسیر کبیر کی زیب التفاسیر کے نام سے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ عالمگیر کی زندگی ہی میں اس نے وفات پائی۔ (۲) بدر النساء بیگم: قرآن حکیم کی حافظہ تھیں۔ علم کے ساتھ عمل کو بھی ملحوظ رکھتی تھیں۔ (۳) زبدۃ النساء بیگم: نہایت عابدہ وزاہدہ تھیں۔ (۴) مہر النسا بیگم۔

ہمارے تیموری بھائی ہندوستان میں برابر دو دو تین تین چار چار شادیاں کرتے رہے لیکن ہندی مسلمانوں پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا، یہ تو اورنگ زیب تھے جو ہر ایک میں کفایت شعاری

کرتے تھے، انھوں نے شعراء کے کلام کو سننا اس وجہ سے موقوف کر دیا تھا کہ اگر ان کے کلام کو سنا جائے گا تو نوازنا پڑے گا اور بیت المال کے مال سے نوازا تو نہیں جاسکتا۔

خوراک پوشاک میں بھی وہ کفایت شعاری سے کام لیتے۔ لیکن بیویاں رکھنا انھوں نے کفایت شعاری کے خلاف نہیں سمجھا۔

وہ خود ٹوپیاں سی کر اور قرآن لکھ کر گزر بسر کرتے تھے پھر ان کی ٹوپیاں بازار میں آکر بک جاتیں لیکن یہ معلوم نہیں ہونے دیا جاتا تھا کہ بادشاہ کی سی ہوئی ہیں۔ عام ٹوپیوں کے ساتھ عام داموں میں فروخت ہوتیں۔ آپ کی زندگی اس لحاظ سے بھی کامل تھی کہ آپ حکومت کی باگ دوڑ احسن طریقہ سے انجام دیتے ساتھ ہی انھوں نے گھر کے افراد بچوں اور بیویوں پر بھی مکمل توجہ دی اور ان کو سنوارا، تعلیم دی اور قابل بنایا۔

شیوا اور سنبھا کا کمال

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک خط میں ابو الحسن کو لکھا تھا: ہماری شاہانہ التفات کے امید دار کو جاننا چاہیے کہ اپنے مراسم ذاتی اور مکارم جبلی کے اقتضا سے ما بدولت و اقبال کی سب سے بڑی مصروفیت یہی ہے کہ خلق آسودہ رہے اور رعایا کے چھوٹے بڑے سب طبقوں کی حالت درست رہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ شریعت غرا کے مقدس قانون کے لحاظ سے اگرچہ نئے بت کدوں کی تعمیر کی اجازت نہیں دی جاسکتی لیکن جو پرانے مندر ہیں وہ ڈھائے بھی نہیں جاسکتے ان ایام عدالتِ انتظام میں یہ خبر ہمارے گوش زد ہوئی ہے کہ بعض عمال از راہ جبر و تعدی قصبہ بنارس اور اس کے نواح کے بعض دوسرے مقامات کے ہندوؤں اور اس علاقے کے برہمنوں پر جو وہاں کے قدیم بت خانوں کے پروہت ہیں تشدد کر رہے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ان برہمنوں کو ان کی پروہتی سے الگ کر دیں جس کا نتیجہ بجز اسکے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ یہ بیچارے پریشان ہوں اور مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔ لہٰذا تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اس منشور لامع النور کے پہنچتے ہی ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص تمہارے علاقے کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہ کرے اور ان کی تشویش کا باعث نہ ہوتا کہ یہ جماعت بدستور سابق اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے منصبوں پر قائم رہ کر اطمینان قلب کے ساتھ ہماری دولتِ خداداد ابد مدت و ازل بنیاد کے حق میں مشغول دعا رہیں۔ اس باب میں تاکید مزید کی جاتی ہے۔

(از کتاب محی الدین اورنگ زیب عالمگیر؛ اس میں اس مکتوب کا فارسی بھی موجود ہے)

عالمگیر کے اس خط میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں: (۱) عالمگیر کا خلق خدا اور رعایا؛ امیر غریب ہندو مسلم اعلی ادنی ہر ایک کی آسودگی، بنیادی حقوق اور ہر طرح کی حفاظت کا اہمیت دینا۔ (۲) شریعت پر عمل کرنے میں کسی کی رو رعایت نہ کرنا۔ (۳) شریعت کی حد میں رہ کر ذمیوں (اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلم) کے حقوق دینا اور انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرنا، اور رواداری کا برتاؤ کرنا۔

ایک مکتوب میں عالمگیر لکھتے ہیں: ''خود کو رعایا سے براہ راست متعارف کراؤ غریبوں کو مواقع دو کہ وہ براہ راست تمہارے پاس آئیں اور اپنی حالت تم سے بیان کریں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ان بیچاروں کو اپنی شکایات کے ازالہ کے لیے کوئی اور وسیلہ تلاش نہ کرنا پڑے گا۔''

اورنگ زیب کو اپنی رعایا کا اس قدر خیال تھا۔ کہ اس نے صراحت کی کہ اگر زمین کا کوئی ٹکڑا کسی معقول وجہ سے کاشت نہ کیا جا سکا ہو تو اس سال اس کا خراج وصول نہ کیا جائے۔ وصولی صرف مزروعہ زمین اور پیداوار پر ہو اور اس وقت ہو جب فصل کٹ کر غلہ کی صورت اختیار کرے۔

ایسی تمام زمینیں جو نیک کاموں کے لیے وقف کی گئی تھیں، ان کے متعلق اورنگ زیب اپنے اس فرمان میں کہتے ہیں: اگر کوئی آدمی اپنی زمین رفاہ عام کے کسی کام کسی سرائے کسی خانقا یا کسی عبادت خانہ کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے تو اسے مالگذاری سے معافی دے دو، تا کہ رفاہ عامہ کے کام میں رکاوٹ نہ ہو۔ (از کتاب محی الدین اورنگ زیب عالمگیر)

اب جو بادشاہ رعایا کی صلاح وفلاح، ان کی خوشنودی وخوش حالی اور ان کی حفاظت ومحافظت کو اولین ترجیح دیتا ہو اور سب سے بڑھ کر اس کو مذہبی فریضہ سمجھتا ہو اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جب اس کے ماتحت علاقوں کے باشندوں پر ظلم کیا جائے گا ان کو لوٹا جائے گا ان کی عزتوں کو پامال کیا جائے گا تو اورنگ زیب جیسا عادل رحم دل منصف منتقم خاموش تماشائی بنا رہے گا اور اس فتنہ اور بلوے کے دفعیہ کے لیے کوئی اقدام نہ کرے گا! کیا اس کو موجودہ عرب حکمران سمجھ لیا ہے؟ جن کی غیرت دینی مر چکی ہے۔ کیا اس کو محمد بن قاسم، زنگی اور ایوبی سے کوئی مناسبت نہیں تھی جو مظلوموں کی دادرسی کے لیے نہ مسافت سفر کی پرواہ کرتے تھے

نہ درازیٔ عمر وصحت کی، بلکہ عالمگیر کو اس اعتبار سے ایک گونہ فضیلت حاصل ہے کہ اس نے یہ سب اقدامات غیر مسلم رعایا کی محافظت اور برہمن عورتوں کی عصمت کی پاسبانی کے لیے بھی کیے ہیں۔ پھر مراٹھوں سے اس قدر لمبی لڑائی کے باوجود بھی اورنگ زیب کا یہ ایک مثالی کارنامہ ہے کہ اس نے لڑائی کے اخراجات کے لیے عوام پر کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا۔ اور نہ ان محصولوں میں سے ہی کوئی محصول دوبارہ لگایا جنہیں وہ شروع میں معاف کر چکا تھا۔

شیواجی نے شاہی علاقوں کے ماتحتوں میں لوٹ مچا رکھی تھی، اور وہاں کے باشندوں کو ہراساں کیا کرتا، اس نے سورت جیسی عظیم شاہی بندرگاہ پر ڈاکہ ڈال کر اس کے خزانے کو لوٹ لیا حتی کہ حاجیوں سے بھی تعرض کیا، بہت سے لوگوں کو اپنے پاس اغوا کر کے لے آتا اور خوب مال طلب کر کے ان کو رہا کرتا۔ کیوں کے اس کے پاس علاقے زیادہ نہیں تھے اس لیے اپنی سوار اور پاپیادہ فوج کے اخراجات وہ لوٹ کے ذریعہ ہی پورے کرتا۔ وہ اگرچہ عیاش نہیں تھا وعدہ خلاف کرنے والا، دھوکے باز عیار ضرور تھا لیکن وہ مسجدوں اور عورتوں کی عصمت پر نہ خود ہاتھ ڈالتا نہ اپنی فوج کو اس کی اجازت دیتا لیکن اس کا بیٹا سنبھاجی ان چیزوں میں اس سے الٹ تھا، شیواجی نے برہمن عورتوں کی عصمت دری کرنے کے نتیجے میں سنبھاجی کو ایک قلعہ میں نظر بند بھی کیا تھا، ان کے کنویں پر عورتیں پانی بھرنے آتیں تو شیواجی نے کبھی ان کو نہیں چھیڑا لیکن سنبھا اپنے دور میں ان پر دست درازی بھی کرتا اور ہتک عزت سے بھی دریغ نہیں کرتا اور اپنے باپ کے مقابلے میں بڑا ظالم اور سفاک واقع ہوا تھا خود اس کی قوم کے لوگ اس سے نالاں اور متنفر تھے، مراٹھے شیواجی کو ایک دیوتا کی طرح پوجتے تھے اس لیے اس کی حرکتوں کو برداشت کیے جارہے تھے ورنہ وہ اپنی ہی قوم کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچتا۔

سید محمد میاں لکھتے ہیں: شیواجی کے انتقال کے بعد ایک طرف تو اپنی آوارگی اور تباہ کاریوں کے باعث وہ اپنی قوم کو خوش نہیں رکھ سکا علاوہ ازیں اس نے استقلال حاصل کرتے ہی برہان پور پر دفعتہ حملہ کر کے نہایت سفاکی اور بے دردی سے تمام شہر کو لوٹا اور آگ لگادی۔ علماء و مشائخ برہان پور نے ایک محضر تیار کر کے عالمگیر کے پاس بھیجا کہ یہ ملک دار الحرب ہو گیا اور اب یہاں جمعہ اور جماعت جائز نہیں۔ عالمگیر نے اب تک بذات خود مرہٹوں کی شرارت پر توجہ نہیں کی تھی لیکن اس کے جواب میں لکھا کہ میں خود آرہا ہوں۔ چنانچہ ۱۰۹۲ھ میں وہ خود دکن

پہنچا۔ (شاندار ماضی)("میں خود ارہا ہوں" اج اسی دینی غیرت کی ضرورت ہے)

اب عالمگیر کا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ عمر دراز ہونے کے باوجود اس طرف بذات خود توجہ نہ دے جس کو علماء نے دار الحرب قرار دے دیا ہو۔

یہ مختصر ذکر ہے ان اسباب کا جس بنا پر عالمگیر نے اپنے امیر الامراء اور سپہ سالاروں کو شیواجی کے مقابلے میں بھیجا اور سنبھا اور برگی مراٹھوں کا صفایا کرنے کے لیے بذات خود جہاد کیا۔

سعدی لکھتے ہیں: حقیقت دیکھی جائے تو دکن میں اورنگ زیب نے جس حکمت عملی پر عمل کیا۔ وہ دور رس نتائج کی حامل تھی۔ اورنگ زیب چاہتا تھا دکن کے ظالم وجابر اور لٹیرے مرہٹوں اور ان کو پناہ دینے والوں کی قوت وطاقت ختم کر کے اس سمت کے عوام کو اس نظام حیات سے متعارف کرائے جو اس کے نزدیک دنیا کا بہترین نظام حیات تھا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں: یہ بات خاص طور سے ذہن میں رہنی چاہیے کہ معاشرے اور نظم حکومت کے بارے میں اورنگزیب عالمگیر جو تصور اور خیال رکھتا تھا اس کی اساس شریعت اسلام ہی کے اصول تھے جنہیں وہ عملی شکل دینے میں تمام عمر کوشاں رہا۔

دراصل یہ لڑائی نہ کوتاہ حکمت عملی تھی نہ تعصب، یہ دکن کے عوام کی اصلاح کی ایک تدبیر اس بوڑھے مسلمان تاجدار نے کی۔ ورنہ تاریخ خوب جانتی ہے کہ شیواجی، اس کے ورثاء اور اس کے ہم پیشہ مرہٹے سردار لوٹ مار کو بہت شریفانہ کاروبار سمجھتے تھے۔ اور نہ صرف ہمسائے ان کی وجہ سے بہت تنگ تھے، ان کی رعایا بھی ان سے بہت نالاں تھی۔ اورنگ زیب نے ان کی قوت وطاقت پر بھرپور وار کر کے انہیں ان کے پنجۂ ظلم سے نکالنا چاہا تھا۔

اس طرح اورنگ زیب کی یہ لمبی لڑائی ایک اصلاحی جدوجہد تھی۔ اور اس جد وجہد کا تماشا جن لوگوں نے کیا ہے۔ وہ ہی جانتے ہیں، کہ اس بوڑھے نے اس جدوجہد میں کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں۔ وہ کن پہاڑوں پر چڑھا اور کن گھاٹیوں میں سے گزرا۔ اور کیسے کیسے نازک مراحل اسے پیش آئے۔ وہ تاریخ کا سب سے زیادہ صابر، سب سے زیادہ محنتی اور سب سے بڑا سپہ سالار ہے۔ وہ نوے برس کی عمر میں بارہ بارہ گھنٹے متواتر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار رہتا، بلاشبہ اس غیر معمولی محنت ومشقت نے اس بوڑھے کے قوی بری طرح متاثر کر دیئے تھے۔

(از کتاب محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بتغییر یسیر)

یہی کمال تھا شیواجی کا کہ اس کا مقابلہ اکبر اور دارا سے نہ تھا بلکہ ایک سچے مسلمان اسلامی حکومت کے عادل فرماں رواں سے تھا اور اس نے مغلوں یا بیجاپوریوں کے خلاف جو مہم شروع کی، اس میں ''دہرم راج'' کی چاشنی دیکر مذہبی رنگ دے دیا تھا تا کہ اس کے متبعین میں بھی وہی مذہبی جوش پیدا ہو جائے جو مسلمان بادشاہ جہاد کے نام سے پیدا کیا کرتے ہیں۔(ہندوستان پر مغلیہ سلطنت)

سید محمد میاں لکھتے ہیں: آج شیواجی کو ایک قابل پرستش کی حیثیت سے عزت و احترام کے بلند آسمان پر بٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن کیا برادران وطن کے سرمایۂ فخر ومباہات میں صرف ایسے ہی بزرگ اور پیشوا ہیں؟ ورنہ پھر اس فرقہ پرستانہ تعصب اور عناد پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

عالمگیر کے لطف و احسان، شرافت اور فراخ حوصلگی اور بلند ہمتی، اور سیواجی کی خود غرضی، تنگ نظری اور پست ہمتی کا موازنہ کیا جائے تو عدل و انصاف کا فیصلہ صرف یہی ہوگا کہ عالمگیر اس لئے قابل ملامت ہے کہ وہ مسلمان تھا، اور شیواجی اسلئے واجب الاحترام اور قابل پرستش ہے کہ وہ ہندو تھا، خواہ وہ کیسا ہی تھا۔ (شان دار ماضی)

سنبھا کا بھی کمال یہی تھا کہ وہ اورنگ زیب کے مقابل تھا اگرچہ ایک مرتبہ بھی اس نے کھل کر اورنگ زیب کا مقابلہ نہیں کیا تھا نہ مغلوں کے مزاحمت میں کوئی فتح ہی حاصل کی تھی، لیکن وہ پکڑا گیا اور منہ در منہ اورنگ زیب کو بے تکان گالیاں بکتا رہا(اس کو زندہ رکھنے میں اورنگ زیب نے سلطنت کے وقار کے لیے مضر جانا) پھر بے دردی سے ۳۱/ سال کی جواں عمر میں قتل کر دیا گیا تو اس کی نالائقی کے باجود بعد میں لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوگئی۔

———

تقوی اور فتوی میں فرق

سوال: تقوی اور فتوی میں کیا فرق ہے؟

جواب: سمجھنے کے لیے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ تقوی اور فتویٰ دونوں ایک ہیں، یعنی دونوں فتویٰ ہیں ان میں سے کسی ایک کو مضبوط دلیل سے قوت حاصل ہو جائے تو وہی فتویٰ تقوی بن جاتا ہے، یوں سمجھیے دو قیاس ہیں لیکن ایک قیاس کو کسی دلیل سے قوت حاصل ہو جائے تو وہی قیاس استحسان یا استحسان بالقیاس الخفی بن جاتا ہے۔

اور عمل استحسان بالقیاس الخفی پر کیا جاتا ہے۔لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ دلیل خفی جو ایک کے نزدیک مسلم ہے دوسرے کے بھی نزدیک ہو، ہوسکتا ہے کسی مجتہد اور مفتی کے نزدیک وہ دلیل خفی غیر مؤثر ہو۔ یا یوں سمجھ لیجیے ایک رخصت اور ایک عزیمت ہے، لیکن عزیمت اور تقوی کی تعیین چوں کہ دلیل خفی سے ہوتا ہے لہٰذا اس میں رائے کا اختلاف محال نہیں ہے۔

دار الافتاء دار العلوم دیوبند کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقوی، اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو بجالانے اور اس کی معصیت اور ناراضگی والے کاموں سے بچنے کا نام ہے۔ اور فتوی، حکم شرعی کو سائل کے لئے دلیل شرعی سے واضح کرنے کا نام ہے۔ "والفَتْوَى فِي الإِصْلَاحِ: تَبْيِينُ الحُكْمِ الشَّرْعِيِّ، عَنْ دَلِيلٍ لِمَنْ سَأَلَ عَنْهُ." (موسوعہ فقہیہ، ج:۳۲/۲۰) أَمَّا فِي اصْطِلَاحِ الفُقَهَاءِ فَإِنَّ التَّقْوَى وَالتَّقِيَّ خُصَّا بِاتِّقَاءِ العَبْدِ لِلّٰهِ تَعَالَى بِامْتِثَالِ أَمْرِهِ وَاجْتِنَابِ نَهْيِهِ وَالخَوْفِ مِنِ ارْتِكَابِ مَا لَا يَرْضَاهُ.، ج:۱۳/۱۸۵۔ تقویٰ؛ یہ عزیمت کا درجہ ہے اور فتوی رخصت کا درجہ ہے، ہمیں تقوی پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اگر تقوی پر عمل نہ ہو سکے تو فتوی پر ضرور عمل کرنا چاہئے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

ایمان و اسلام میں امن کا پیام

سوال: بعض لوگ اسلام میں آتنک واد اور دہشت گردی سے جوڑتے ہیں۔ اور اس طرح ویڈیوز برادران وطن سے بربنائے عصبیت باصرہ نواز ہوتی رہتی ہیں۔ لہذا مناسب سمجھا ایمان جو امن سے ہے اور اسلام جس میں سلامتی ہے اس امن و امان اور سلامتی و سلام کا پیغام احادیث کی روشنی میں لوگوں کے سامنے ذکر کیا جائے۔

جواب: ایمان و اسلام کے نام میں ہی سلامتی ہے، مسلم مطیع و فرماں بردار اور مومن خوف سے امن دینے والے کو کہتے ہیں۔ اسلام سے پہلے خوف و دہشت تھی، لوگ اپنے سے طاقت وروں سے خائف رہتے تھے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو لقب دیا سلامتی والا اور امن والا۔

ہر قوم میں ملاقات کے وقت کچھ کلمات کہے جاتے ہیں، اسلام نے اس وقت بھی یہی دعائیہ کلمہ رکھا: ''السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ'' یعنی ملاقاتی کو گویا ایک پیغام دے رہے ہیں کہ آپ ہم سے مامون ہو۔

جنت میں لے جانے والے خاص تین عملوں میں ایک عمل یہ کہا گیا: کہ اس کے پڑوسی اس کی ایذا سے محفوظ رہیں۔ (بخاری) کہا گیا کہ جو اپنے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان کو محفوظ رکھے وہی پکا مسلمان ہے۔ (مسلم) یہ بھی کہا گیا کہ مومن وہ ہے کہ لوگ اپنے جان و مال کے بارے میں اس سے مطمئن ہوں۔ (ترمذی) قسم کھا کر آپ ﷺ نے یہ بات بھی ارشاد فرمائی: وہ مومن کہلانے کا حقدار ہی نہیں ہے جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے وہی (خیر) پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (نسائی) یہاں تک کہہ دیا گیا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ (مسلم)

ابن ابی لیلی تابعی فرماتے ہیں ہم کو نبی کریم ﷺ کے صحابہ نے بیان کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رات میں چل رہے تھے، پس ایک شخص ہم میں سے سوگیا تو ایک شخص سونے والے شخص کے پاس سے رسی اٹھانے لگا جس وہ ڈر گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ کسی مسلمان کو گھبراہٹ میں مبتلا کرے۔ (ابوداود)

کسی جانور کو بھی بلا وجہ پریشان نہیں کرنا چاہیے:

حضرت عبد الرحمن بن عبد اللہ اپنے والد ماجد کا بیان نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول

اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، آں حضرت ﷺ قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے، تو ہم نے دیکھا ایک چڑیا تھی، اس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے، ہم نے ان دونوں بچوں کو پکڑ لیا، پھر چڑیا آئی تو وہ زمین پر اپنے پر بچھانے لگی، آپ ﷺ تشریف لائے تو فرمایا: چڑیا کو اس کے بچوں کی وجہ سے کس نے پریشان کیا ہے؟ اس کے بچے اس کو دے دو۔ اور آپ ﷺ نے چیونٹیوں کے رہنے کی جگہ کو دیکھا جس کو ہم نے جلادیا تھا، آپ ﷺ نے

فرمایا کہ اس کو کس نے جلایا ہے، ہم نے عرض کیا کہ ہم نے جلایا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: آگ کا عذاب دینا مناسب نہیں ہے سوائے آگ کے رب کے۔ (ابو داؤد)

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے تسمہ کو دونوں انگلیوں کے درمیان پھاڑنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابو داؤد)

چمڑے کے ٹکڑے کو اس طرح پر کاٹا جائے کہ وہ دو انگلیوں کے بیچ میں ہو، یعنی چمڑا کاٹنے والا کسی شخص سے کہے کہ جس جگہ سے مجھے چمڑا کاٹنا ہے اس کو تم اپنی دونوں انگلیوں کے درمیان دبالو اور پھر کاٹنے والا اس چمڑے پر اپنا آلہ چلائے تا کہ وہ چمڑا سہولت سے کٹ جائے اس عمل سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اس میں انگلیوں کے درمیان چمڑا دبانے والے کی انگلیاں کٹنے کا خطرہ ہے، آپ ﷺ کی تعلیمات کسی قدر جامع ہیں کہ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بھی ادب سکھایا گیا ہے۔ اور جس چیز میں اپنے یا دوسرے کے ادنی درجہ خطرہ کا اندیشہ ہو اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ (الدر المنضود: ۳۵۱/۴)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نیام سے نکلی ہوئی تلوار دینے سے منع فرمایا ہے۔ (ابو داؤد، ترمذی)

اسی کے مانند چھری، چاقو اور تیر وغیرہ کا حکم ہے، یہ چیزیں کھلی اوسونتی ہوئی کسی کو نہ دینا چاہئے، چاقو چھری وغیرہ بند کر کے دے۔ تا کہ غلطی سے لینے والا زخمی نہ ہو اور فتنہ نہ ہو اسی طرح چاقو چھری وغیرہ کا دھار دار حصہ خود پکڑ کر دستہ کی طرف سے دوسرے کو دینا بھی درست نہیں اسلئے کہ بعض دفعہ خود دینے والے کے زخمی ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اسلئے احوط شکل یہ ہے کہ جب کھلا ہوا چاقو وغیر کسی دوسرے کو دینا چاہیں تو زمین یا میز وغیرہ پر رکھدیں تا کہ دوسرا شخص آسانی سے اسکو اٹھالے۔ حدیث پاک سے دین کی جامعیت اور آپ ﷺ کی امت پر

کمال شفقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ ملک شام میں کچھ نبطی لوگوں کے پاس سے گذرے ان کو دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا، اور ان کے سروں پر تیل ڈالا گیا تھا، ہشام نے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہیں جواب دیا گیا کہ ان لوگوں کو خراج کی وجہ سے عذاب دیا جارہا ہے، ہشام بولے میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دیں گے، جو دنیا میں لوگوں کو (ناحق) عذاب دیں گے۔ (مسلم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا جو ہمارے (مسلمانوں) کے خلاف ہتھیار اٹھائے، تلوار سونتے وہ ہم میں سے نہیں (اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں) (مسلم)

ایک حدیث میں فرمایا: جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف لوہے (ہتھیار) سے اشارہ کرے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں تا آں کہ وہ ہتھیار رکھ دے۔ (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے، اس لئے کہ وہ نہیں جانتا کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ میں سے ہتھیار کھینچ لے، (اور کسی کا ناحق قتل ہو جائے) جس کی وجہ سے وہ جہنم کے گڑھے میں گر جائے۔ (بخاری)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: کہ جب تم میں سے کوئی شخص ہماری مسجد یا ہمارے بازار سے گذرے اور اس کے پاس تیر ہوں تو اس کو چاہئے کہ تیر کے پھل کو پکڑ لے کہیں کسی مسلمان کو نہ لگ جائے۔ (بخاری)

بعض لوگ بیٹھے بیٹھے کنکر پھینکتے رہتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا، حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو کنکری پھینکتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: کہ کنکری مت پھینکو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں پھینکنے سے منع فرمایا ہے، آپ نے فرمایا: کہ ان سے نہ تو شکار ہوتا ہے اور نہ دشمن زخمی کر کے ہلاک کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کنکریاں (راہ چلتے کی) دانت توڑ دیتی ہیں اور آنکھ پھوڑ دیتی ہیں۔ (بخاری)

کسی بے جان کا قتل کرنا اسلام میں اتنا گراں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دنیا کا ختم ہوجانا اللہ تعالی ہر آسان ہے ایک مسلمان کے قتل کے مقابلے میں۔ (نسائی)

قرآن کریم میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں: جس نے کسی کو -- کسی شخص کے قتل یا زمین

میں فساد مچانے کے جرم کے بغیر--قتل کر دیا، گویا اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا، اور جس نے ایک جان کی زندگی بچائی، گویا اس نے پوری انسانیت کو بچایا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر تمام کائنات کسی ایک مؤمن کو قتل کرنے میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو جہنم میں اوندھے منہ ڈالے گا۔ (ترمذی)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پانچ یا سات لوگوں کو قصاص میں قتل کیا جنھوں نے مل کر ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر صنعاء کے سارے لوگ مل کر اس کو قتل کرتے تو میں تمام اہل صنعاء کو قصاص میں قتل کروادیتا (مالک) یہ انسانی جان کا احترام ہے۔

اسی وجہ سے قیامت کے دن سب سے پہلے ناحق خون کرنے کا ہی مقدمہ چلایا جائے گا، قاتل مقتول کو سر سے پکڑ کر اپنے رب کے پاس لائے گا اس حال میں کہ اس کی رگیں خون بہارہی ہوں گی اور کہے گا کہ اے رب پوچھیے اس سے کیوں اس نے مجھے مارا تھا، اس جرم کی پاداش میں اس کو جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ (ترمذی)

لڑائی کے موقعے پر ہر زمانے میں ہر ملک کے لوگ کھلی اجازت دیتے ہیں کہ جس کو چاہے مارو، چاہے بچہ ہو بھوڑا، عورت ہو یا امن پسند شہری۔ لیکن اسلام کی طرف سے واضح پابندی ہے کہ کسی عورت، بچوں، بوڑھوں اور امن چاہنے والوں کو قتل نہیں کیا جائے گا، حتی کہ کوئی میدان جنگ میں مسلمانوں کو قتل کرنے کے بعد مغلوبی کی حالت میں مسلمان ہو جائے تو اس کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا، یہی حالت پیش آئی تھی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے عذر خواہی کرتے ہوئے کہا: مجھے ایسا لگا اس نے یہ کلمہ جان بچانے کے لیے پڑھا ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا آپ نے سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا ایک روایت میں ہے آپ نے فرمایا: آپ کیا کریں گے اس وقت جب وہ قیامت کے دن لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ لے کر آئے گا۔ (بخاری)

———

موبائل میں قرآن شریف پڑھنے کا حکم

سوال: موبائل میں قرآن شریف پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ مولانا سعد صاحب اس پر سخت ملامت کرتے ہیں۔ نیز موبائل پر پڑھنے کی صورت میں وضو کا کیا حکم ہے؟

جواب: حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ فرماتے ہیں: مرکز نظام الدین میں جو اس وقت امیر ہیں مولانا سعد صاحب وہ یہ کہتے ہیں کہ موبائل میں قرآن کریم پڑھنا جائز ہی نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا جو مولانا سعد صاحب کہتے ہیں لیکن مسجد میں بہت سارے قرآن کریم رکھے ہوئے ہیں تو موبائل میں پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور اپ کے گھر میں بھی قرآن ہے کوئی مسلمان کا گھر قرآن سے خالی نہیں ہوتا ہے۔ لہذا قرآن لے کر پڑھنا چاہیے۔ موبائل میں قرآن کریم جو پڑھتے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب ڈاؤن لوڈ کرو گے تب ہی تو پڑھو گے اور وہ ڈیجیٹل میں جائے گا اور ڈیجیٹل خرافات کا مجموعہ ہے۔ تو اس ڈیجیٹل میں اللہ کے بندو قرآن کریم کو کیوں ڈالتے ہو۔ البتہ دونوں میں پڑھنے کا ثواب یکسا ہوگا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں: آج کل موبائلوں میں آگئے ہیں، تو سوال کرتے ہیں کہ موبائل میں قرآن کریم پڑھنا کیسا ہے؟ جواباً عرض ہے کہ جائز تو ہے لیکن قرآن کریم کا نسخہ سامنے رکھ کر پڑھنا اور اس میں دیکھ کر پڑھنا زیادہ افضل اور بہتر ہے۔ اس میں ثواب زیادہ ہے۔ یہ جو ہم کو موبائل میں قرآن کریم نظر اتا ہے یہ قرآن نہیں ہے یہ قرآن کریم کا عکس ہے۔ جیسے ائینے میں قرآن کریم نظر ارہا ہو اس کے وہ احکام نہیں ہوتے جو حقیقی قرآن کریم کے ہوتے ہیں۔ ناجائز بھی نہیں ہے لہذا اگر کوئی سفر میں جارہا ہے اور قرآن کریم موبائل میں دیکھ کر پڑھ لے تو گناہ بھی نہیں ہے بعض لوگ اس کو گناہ سمجھنے لگے ہیں۔

دار الافتاء دار العلوم دیوبند میں ہے: بہتر تو یہی ہے کہ مصحف میں دیکھ کر قرآن کی تلاوت کی جائے؛ تاہم اگر آدمی سفر وغیرہ میں ہو اور وہ چاہے کہ موبائل سے دیکھ کر قرآن کی تلاوت کرے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور ان شاء اللہ اس کو تلاوت کا ثواب ملے گا۔

موبائل میں قرآن کو پڑھنا، قرآن کریم کی تلاوت موبائل، ٹیبلٹ یا کمپیوٹر کی اسکرین پر تلاوت کرنا جائز ہے؟

اس صورت میں بھی وہی آدابِ تلاوت ہوں گے جو مصحف میں دیکھ کر پڑھنے کے وقت

ہوتے ہیں۔موبائل وغیرہ کی اسکرین پر اگر قرآن کریم کے نقوش نہ ہو تو اس کو بالاتفاق غیر متوضی (بلاوضو) یا جنبی ہاتھ لگا سکتا ہے۔لیکن اگر قرآن کریم کے نقوش اسکرین پر موجود ہوں تو جنبی یا غیر متوضی اس موبائل یا اسکرین کو چھو سکتا ہے یا نہیں اس میں تین اقوال ہیں۔

۱۔موبائل، کمپیوٹر ٹیبلٹ کی اسکرین کو اس وقت چھونا جائز نہیں،ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ اس حالت میں مصحف کے مانند ہے اور ارشاد ربانی ہے :لَا يَمَسُّهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ،اس کے قائل شیخنا و سندنا و سیدنا حضرت مولانا مفتی احمد صاحب مد ظلہ ہیں اور دارالعلوم کا بھی یہی فتوی ہے نیز الفتاوی مهمه فی ماابتلت به العامه نامی کتاب میں بھی یہی مذکور ہے۔

۲۔صرف جس اسکرین پر قرآن کریم کے نقوش ظاہر ہو رہے ہیں اس کا چھونا جائز نہیں، موبائل و کمپیوٹر کے دیگر پارٹس کو بلا وضو بھی چھو سکتے ہیں۔ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کے حکم میں نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو موبائل کے دیگر پارٹس غلاف منفصل کے حکم میں ہوں گے۔ملاحظہ فرمائیے۔جواب... واضح رہے کہ جب قرآن کریم موبائل یا میموری کارڈ کے اندر ہو یعنی اس کو اسکرین پر کھولا نہ گیا ہو، تو اس وقت چوں کہ قرآن کریم حروف ونقوش کی صورت میں موجود نہیں اس لیے اس کو ہاتھ لگانے کے لیے باوضو ہونا ضروری نہیں۔اور جب موبائل یا میموری کارڈ کے حافظے میں موجود قرآن کریم کو اسکرین پر کھول لیا جائے تو اس وقت چوں کہ اسکرین پر موجود نقوش قرآن کریم کے الفاظ پر دلالت کرتے ہیں، اس وقت اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لیے وضو ہونا ضروری ہے اور اس صورت میں چوں کہ قرآن کریم کا صرف وہی حصہ حروف کی شکل میں ہے جو اسکرین پر نظر آرہا ہے، لہٰذا اسکرین کو ہاتھ لگانا طہارت کے بغیر جائز نہ ہوگا اور اسکرین کے علاوہ موبائل کے بقیہ حصوں کو ہاتھ لگانا جائز ہوگا۔البتہ عظمت کا تقاضہ اور مناسب و احوط یہ ہے کہ بقیہ حصوں کو وضو کے ساتھ چھوا جائے۔جامعہ علوم الاسلامیہ

۳۔تیسرا قول یہ ہے کہ اس اسکرین کو بھی ہاتھ لگا سکتے ہیں اور دیگر پارٹس کو بھی، ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کاغذ پر قرآن کریم لکھ کر اس کو فریم میں کر دیا ہو۔ملاحظہ فرمائیں۔موبائل یا کمپیوٹر اسکرین پر نظر آنے والی قرآنی آیات کو بلا وضو یا حالتِ جنابت میں چُھونا جائز ہے، کیونکہ موبائل یا کمپیوٹر کی سکرین پر جو آیات نظر آتی ہیں، وہ "سافٹ وئیر" ہیں یعنی ایسے نقوش ہیں، جنہیں چُھوا نہیں جاسکتا۔نیز ماہرین کے مطابق یہ نقوش بھی کمپیوٹر

یا موبائل کے شیشے پر نہیں بنتے بلکہ "ریم" پر بنتے ہیں اور شیشے سے نظر آتے ہیں لہٰذا اسے مصحفِ قرآنی کے "غلافِ منفصل" پر قیاس کیا جاسکتا ہے یعنی ایسا غلاف جو قرآنِ کریم کے ساتھ لگا ہوا نہ ہو بلکہ اس سے جُدا ہو۔ اس کے ساتھ قرآنِ کریم چُھونے کو حضرات فقہائے کرام کی صراحت کے مطابق جائز قرار دیا گیا ہے (دیکھئے الدر المختار ج۱ ص ۲۹۳ وھندیہ ج۱ ص۳۹ وحاشیۃ الطحطاوی علی المراقی ص ۲۷، ۲۸)

اسکرین پر نظر آنے والی آیات کی مثال ایسی ہی ہے کہ گویا قرآنی آیات کسی کاغذ پر لکھی ہوئی ہوں اور وہ کاغذ کسی شیشے کے بکس میں پیک ہو، پھر باہر سے اس شیشے کو چُھوا جائے تو اس میں شرعاً کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا کیونکہ غلافِ منفصل کی طرح ایک تو یہ شیشہ اس جگہ سے جُدا ہے، جہاں آیات کے نقوش بن رہے ہیں۔ نیز فقہائے کرام نے صندوق کی مثال دے کر فرمایا کہ اگر اُس کے اندر مصحف موجود ہو تو اس صندوق کو جنبی شخص کے لیے اُٹھانا اور چُھونا جائز ہے، لہٰذا موبائل یا کمپیوٹر سکرین پر نظر آنے والی قرآنی آیات کو حالتِ جنابت میں یا بلا وضو چُھونا اور پکڑنا جائز ہے اور بے وضو شخص کے لیے اس سے تلاوت کرنا بھی جائز ہے۔ بندے کے نزدیک۔ قول اول احوط و اصح ہے اور دوسرے قول پر بھی عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

———

شہر نوساری کی وجہ تسمیہ

سوال: نوساری شہر جو گجرات میں ڈابھیل کے مضافات میں ہے اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

جواب: ہمارے ایک ساتھی سے کبھی سنا تھا کہ ''نوساری'' کو نوساری، ''نوساڑھی'' کی وجہ سے کہتے ہیں، مجھے لگا کہ مذاق کر رہا ہوگا۔

آج تاریخ جامعہ (اول) مؤلفہ حضرت الاستاذ مفتی عبد القیوم صاحب راجکوٹی دامت برکاتہم میں پڑھا کہ نوساری کو پہلے ''گدانگری'' کہتے تھے، یہاں کا ایک شخص خوب جادو جانتا تھا اور لوگوں میں بھی اس کا رواج تھا، انسانی جان بلی کے طور پر چڑھائی جاتی تھی۔

یہ علاقہ کسی طرح فتح ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا، قطب الدین ایبک کی فوج کشی ناکام ہوتی جارہی تھیں، اسی پیچ و تاب میں جب وہ ایک رات سویا تو نبی اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی اور بشارت ہوئی کہ ایک خیمہ میں ۱۳/ سادات ہیں ان کے ہاتھ پر وہ علاقہ فتح ہوگا۔

ایبک نے ان حضرات کو تلاش کیا نبی کریم ﷺ کا سلام پہنچانے کے بعد فرمان سے آگہی دی پھر وہ حضرات شوق شہادت لیے ہوئے اعلائے کلمۃ اللہ کے خاطر وارد گجرات ہوئے۔

گھمسان کا رن پڑا ان سادات میں سے نوشہید ہوئے۔ اور نوساری فتح ہوا۔ یہ نو ایک ہی ماں کی اولاد تھے ان کی والدہ کو مرتبۂ شہادت پر خوشی اور بیٹوں کی جدائی پر رنج ہوا اور بارگاہ ایزدی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا کہ اے خدا اس علاقہ کا نام ان نوشہیدوں پر یاد کیا جائے۔

خواب میں بشارت ہوئی کہ ایسا ہی ہونا ہے۔ چناں چہ پھر ان نو نوشہید کی مزاروں پر نو چادریں ڈالی جانے لگیں جن کو ساڑھی کہا جاتا تھا اسی وقت سے اس بابرکت جگہ کا نام ''گدانگری'' سے ''نوشہید'' پھر نوساڑھی پھر ''نوساری'' ہوگیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: نوشہیدوں کے سر نوساری میں اور دھڑ سورت میں ہیں۔ (از تاریخ جامعہ، ملخصا بتغیر کثیر)

اسلام میں شجاعت کا مقام

سوال: ہجومی تشدد، ہراساں کرنا، مسلمانوں پر بے جا تشدد کرنا اور ناکردہ گناہ کے بموجب گھر کو بلڈوزر سے منہدم کر دیا جانا ہندوستان میں آئے دن کی خبریں ہیں، مسلمان اپنے قاعدین کا رونا روتے ہیں جب کہ ان اس صورت اپنی حفاظت آپ کا حکم مقدم ہے جس پر فضیلت بھی وارد ہوئی ہے کہ اگر جان جاں آفریں کے سپرد کر دی تو وہ مقبول ہوگی اور شہادت کے درجہ پر فائز ہوگی۔ لہٰذا مناسب سمجھا تقریر و تحریر کے ذریعہ مسلمانوں کو اس سے آگاہی دی جائے۔

جواب: امام غزالی فرماتے ہیں کہ امہات الاخلاق اور اصول الخلق چار ہیں: دانائی، شجاعت، پاکدامنی اور انصاف۔

بہادری ایک اہم صفت ہے جس سے آراستہ ہونے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔

شجاعت ثابت قدمی اور خوف کے مقام پر ڈٹے رہنے کو کہتے ہیں۔ بہادر وجری آدمی آگے بڑھتا ہے اور حق کی مدد کرتا ہے۔ باطل سے نہ خوف کھاتا ہے نہ ملامت کی پرواہ کرتا ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ کی شخصیت اس وصف کے تعلق سے بھی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب گھمسان کا رن پڑتا تو نبی کریم ﷺ کی ذات ہمارے لیے جائے حفاظت ہوتی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: آپ بدر میں دشمنوں کے سب سے زیادہ قریب تھے اور آپ لوگوں میں سب سے زیادہ سخت تھے باعتبار لڑنے کے۔ (مسند احمد)

غزوہ حنین میں مسلمانوں پر گھات لگا کر اچانک حملہ کرنے کی وجہ سے مسلمان وقتی طور پر منتشر ہو گئے لیکن نبی کریم ﷺ ڈٹے رہے اور لوگوں کو اپنی طرف بلاتے رہے اور یہ پکارتے رہے۔

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ، أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ. (ترمذی)

حضرت انس کہتے ہیں کہ آپ احسن الناس اور اشجع الناس تھے۔ ایک رات مدینہ منورہ میں کوئی افواہ اڑی (دشمنوں کے حملہ آوری کی یا کچھ اور) لوگ اس جانب نکلے ہی تھے کہ انھوں نے اس سمت سے نبی کریم ﷺ کو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر آتے ہوئے دیکھا وہ فرمارہے ہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فکر مت کرو (اطمینان رکھو)۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہادروں ہی میں براہ راست مبعوث فرمایا تھا صحابہ بھی بہادر تھے،

قرآن کہتا ہے: اور جب لوگوں نے صحابہ کو کہا کہ لوگ (کفار) تمہارے مقابلے کے لیے اکٹھا ہو گئے ہیں۔ اس لئے تم ان سے ڈر کر رہو تو اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا اور ان لوگوں نے کہا: ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ (سورۂ آل عمران)

صحابہ کی شجاعت کے لیے یہ بات بھی کافی ہے کہ وہ ہر حال میں نبی کریم ﷺ کے شانہ بہ شانہ لڑے ہیں بنی اسرائیل کی طرح کبھی آپ کے بعد بھی یہ نہیں کہا

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ. (سورۂ مائدہ:۲۴)

مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول ذرا بتلایئے اگر کوئی شخص میرا مال لے لینا چاہے تو میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا: اس کو مت دو۔

کہا کہ اگر وہ مجھ سے (اس بات پر) قتال کرے تو؟

فرمایا: تم بھی اس سے قتال کرو۔

اگر اس نے آپ کو قتل کر دیا تو آپ جنتی ہیں اگر آپ نے اس کو قتل کر دیا تو وہ جہنمی ہے۔

نسائی شریف میں ہے جو ظلم کے دفع کرنے میں مارا گیا اس کے لیے جنت ہے ایک روایت میں اس کو بھی شہید کہا گیا ہے۔

ایک روایت میں ہے جو اپنے مال، اپنے اہل وعیال، اپنے دین اور اپنے خون کی حفاظت کے لیے لڑے اور مرجائے وہ شہید ہے۔ (نسائی شریف)

یہ نبی کریم ﷺ کی عام مسلمانوں کو تعلیم ہے کہیں پر بھی ہتھیار ڈال کر تماشا دیکھنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

آج ہم سے اوقاف سمجھو کہ چھین ہی لیا گیا۔ ہماری موبی لنچنگ کچھ مشکل کام نہیں رہا ہمارے گھروں کو بہانا بنا کر ملیامیٹ کر دینا آئے دن کا ڈرامہ ہے۔

اگر ہم بہادری دکھائیں اور ہر گھر پر بلڈوزر چلنے کے وقت یا اوقاف پر غلط نگاہ ڈالنے کے وقت ہم آہ واویلا کرنے کے بجائے ہم میں سے کچھ شہید ہوجائیں تو اس حدیث کی برکت لوگ اپنی نگاہوں سے دیکھیں گے ان شاءاللہ۔

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: کئی کروڑ مسلمانوں کی جو

بھیڑ کشمیر سے لے کر مدراس تک آباد ہے۔ اس کی غیرت وحمیت کا جنازہ ہمیشہ کے لئے نکل چکا ہے۔جس قوم کے افراد اتنے بزدل، ناکارہ پست ہمت، پست حوصلہ اتنے۔ بے غیرت و بے حمیت ہوں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی جان و مال اور عزت و برو کی متاع گرانمایہ سر بازار لگتی رہے اور وہ صرف حکومت اور وائسرائے کی خدمت میں درخواست پیش کرنے کے سوااور کچھ نہ کریں نہ ان کے بدن میں جہد وعمل کی حرارت پیدا ہوں اور ان کی رگوں میں سر فروشی و جاں بازی کا خون جوش میں آئے۔ اس قوم کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کارگاہ جد و جہد اور دنیا سعی و نتائج میں زندہ رہنے کا مطالبہ کرے جو قوم اپنے سہارے نہیں جی سکتی وہ دوسروں کے سہارے بھی نہیں جی سکتی۔

ایک عربی تحریر میں مندرجۂ ذیل ملفوظ نظر نواز ہوئے:

ترجمہ: ہم نے رسولِ اکرم ﷺ کو بزدلی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہوئے پایا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ وہ ان کلمات کے ذریعے دعا کرنے کا حکم دیتے اور بیان کرتے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے دعا کیا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ، وَأَعُوذُ بِكَ أَنْ أُرَدَّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ.

اے اللہ! میں بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اور بزدلی سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اور اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ مجھے بڑھاپے کی ذلت کی طرف لوٹا دیا جائے، اور دنیا کے فتنوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اور بزدل کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی بزدلی اس کی موت کو ایک لمحے کے لیے بھی مؤخر نہیں کرسکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ. (الأعراف: ۳۴)

جب ان کا وقت آجاتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اور اسے شجاعت کا سبق خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے سیکھنا چاہیے — جو ''اللہ کی تلوار'' کہلائے جنہوں نے وفات کے وقت فرمایا: میں نے اتنے معرکے لڑے کہ میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس پر تلوار کا زخم، نیزے کا نشان یا تیر کا نشانہ نہ ہو، اور اب میں اپنے بستر پر اونٹ کی

طرح طبعی موت مر رہا ہوں۔ تو بزدلوں کی آنکھیں نیند سے محروم رہیں!

بزدلی ان بدترین صفات میں سے ہے جن سے مردوں کو متصف نہیں ہونا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”شرُّ ما في رجلٍ شُحٌّ هالعٌ وجُبنٌ خالعٌ“.

آدمی میں سب سے بدتر چیز حریص بزدلی اور دل دہلا دینے والی بزدلی ہے۔ (مسند احمد)

اگر بزدلی انسان کے اندر جڑ پکڑ لے اور اس کے اخلاق پر غالب آجائے تو اس کا انجام بے غیرتی، عزتوں کی پامالی، حرمات کی بے ادبی بلکہ وطنوں کی غلامی تک پہنچ جاتا ہے۔

کیونکہ بزدل آدمی زندگی کے کسی بھی معیار پر قانع رہتا ہے، مگر اپنی جان یا آرام کو خطرے میں نہیں ڈالتا، خواہ اپنی عزت، اہل و عیال یا مال کی حفاظت ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ.

وہ ہر آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ (المنافقون: ۴)

یعنی بزدل انسان لوگوں سے اللہ سے زیادہ ڈرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا.

وہ تمہارے بارے میں بخیل ہیں، جب خوف (کا وقت) آتا ہے تو تم انہیں دیکھتے ہو کہ تمہاری طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے موت کے سایے میں ڈوبے ہوں، اور جب خوف جاتا رہتا ہے تو وہ تمہیں تیز زبانوں سے چبھنے لگتے ہیں، خیر پر بخیل رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لائے، پس اللہ نے ان کے اعمال اکارت کر دیے، اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ (الأحزاب: ۱۹)

اسی لیے بزدل کبھی بھی سردار یا رہنما نہیں بن سکتا۔

ہم از خود کسی کو تکلیف نہ دیں، ہمیں تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم خیر و بھلائی کی کنجی بنیں، ہم جہاں رہیں خیر پھیلائیں حسن عبادت، مکارم اخلاق، تعلیم و تعلم، اخلاص اور جذبہ خیر خواہی سے

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خیر (نیکی) کے دروازے کھولنے والے اور شر (برائی) کے دروازے

بند کرنے والے ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شر کے دروازے کھولنے والے اور خیر کے دروازے بند کرنے والے ہوتے ہیں۔ پس خوشخبری ہے اس شخص کے لیے جس کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ نے خیر کے دروازے کھولے، اور ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جس کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ نے شر کے دروازے کھولے۔ (سنن ابن ماجہ: ۲۳۷)

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ بعض لوگ بیماری (بیماری کو اٹھانے والے) ہوتے ہیں اور بعض لوگ شفا (شفا کے حامل ہوتے ہیں۔) بعض لوگ خیر کی کنجی ہوتے ہیں اور بعض لوگ شر کی کنجی ہوتے ہیں۔

[مصنف ابن ابی شیبہ/ کتاب الزہد/ حدیث: ۳۵۳۹۴]

خطا کار اس بات کا سزاوار نہیں کہ اس کا برے ناموں سے تذکرہ کیا جائے

سوال: بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ کسی کی خطا معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں اگر بدکہ نہ لیں تو بھی پوری زندگی وہ صاحب معاملہ سے پُرخاش رہتی ہیں اور دلوں میں خلش باقی رکھتے ہیں۔ اسی طرح میاں بیوی اپنی چپقلشیں برسوں دل و دماغ میں تازہ رکھتے ہیں اور عین مباحثہ کے دوران بروقت بول پڑتے ہیں۔ اس سلسلے میں حدیث شریف میں کیا رہنمائی ہے؟

جواب: حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی جن کا نام عبد اللہ لقب حمار تھا، وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا بھی کرتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شراب پینے کی وجہ سے کوڑے مارے تھے، ایک دن ان کو لایا گیا تو آپ نے ان کے متعلق (کوڑے مارنے کا) حکم دیا، چنانچہ ان کو کوڑے مارے گئے، لوگوں میں سے ایک صاحب نے کہا اللہ اس پر لعنت کرے کتنی زیادہ مرتبہ اس کو لایا جاتا ہے! حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر لعنت مت بھیجو، اللہ کی قسم میں تو یہی جانتا ہوں، کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ (متفق علیہ)

ایک شخص کو شراب کی سزا دی گئی تو کسی نے کہا اللہ تجھے رسوا کرے تو اپ نے فرمایا: اس طرح مت کہو، تم لوگ اس کے مقابلے میں شیطان کی مدد مت کرو۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ماعز) اسلمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشرف لائے اور انہوں نے اپنے خلاف چار مرتبہ اس بات کی گواہی دی کہ انہوں نے ایک عورت سے حرام کاری کی ہے، آپ ہر مرتبہ ان سے منھ پھیر لیتے تھے، پانچویں مرتبہ میں آپ نے فرمایا کیا تو نے اس سے صحبت کی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! آپ نے فرمایا: کیا تیرا عضو بیوی کی شرمگاہ میں غائب ہو گیا تھا؟ اس نے کہا جی ہاں! آپ نے فرمایا ایسے ہی غائب ہو گیا جیسے کہ سلائی سرمہ دانی میں اور رسی کنویں میں غائب ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں، آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ زنا کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے اس عورت سے حرام طریقہ پر وہی کام کیا جو کہ شوہر اپنی بیوی سے حلال طور پر کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کہنے سے تمہارا مقصود کیا ہے؟

انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو پاک کر دیں، چنانچہ آپ نے ان کے متعلق (رجم) حکم فرمایا تو وہ رجم کر دیئے گئے، پھر آپ ﷺ نے اپنے اصحاب میں سے دولوگوں کو بات کرتے ہوئے سنا کہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ اس شخص کو دیکھو اس پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو چھوڑا نہیں۔ یہاں تک کہ اس کو ایسے ہی سنگسار کر دیا گیا جیسے کتے کو پتھروں سے مار دیا جاتا ہے، آپ ﷺ ان دونوں کے سلسلہ میں خاموش رہے، پھر کچھ دیر چلتے رہے، یہاں تک کہ ایک مرے ہوئے گدھے کی لاش کے پاس سے گذرے جس کے پیر اٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کہ فلاں اور فلاں کہاں ہیں دونوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم یہیں ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں اترو اور اس گدھے کی لاش سے کھاؤ، دونوں بولے کہ اے اللہ کے رسول! اس میں سے کون کھا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم دونوں نے اپنے بھائی کی ابھی جو آبروریزی کی ہے، وہ اس مردار کے کھانے سے زیادہ سخت ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، بلا شبہ ماعز اب جنت کی نہروں میں ہے وہ اس میں غوطہ لگا رہا ہے۔ (ابوداؤد)

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سزا جاری کرنے میں آپ بڑی احتیاط فرماتے تھے۔

تعدد ازدواج سے متعلق چند مسائل اور ان کا جواب

سوال: کیا میں نابالغ بچیوں کی ماں سے دوسرا نکاح کرسکتا ہوں؟ اس دوسری بیوی سے حقوق معاف کرا سکتا ہوں؟ دو بیویوں کے درمیان برابری کن چیزوں میں ضروری ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو کامل و مکمل ہی نہیں بلکہ اکمل بنایا ہے اور اس اکملیت کا اعلان اپنے کلام پاک میں بھی کیا ہے۔ دین اسلام کا ہر امر حکیمانہ اور ہر حرف سہانا ہے۔ اس کے تمام احکام مضبوط اور مستحکم ہیں اور اپنے اندر بے شمار فوائد اور مصلحتیں سموئے ہوئے ہیں، افراط و تفریط سے پاک معتدل اور درمیانہ ہیں۔

مسئلہ تعددِ ازدواج پر ہی غور کر لیجیے؛ کسی مذہب میں تو بیویاں رکھنے کی کوئی حد ہی نہیں تھی اور کسی میں ایک سے زیادہ کو بے حد سمجھا جاتا تھا، اور آج کی طرح ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا سماجی جرم اور پہلی بیوی کے حق میں ناانصافی باور کیا جاتا تھا۔

حالاں کہ جوازِ حکمِ تعددِ ازدواج میں عورتوں کے حقوق کی بھی رعایت ہے اور مرد کے مزاج کی بھی، ایک سے زیادہ نکاح کرنے میں حفاظت ہے شرم گاہ کی، عفت ہے نگاہوں کی، اور تکمیل ہے نفسانی حاجت کی۔

کوئی خاتون گھر بیٹھے مطلوبہ رشتہ کے لیے عمرِ دراز گزار دے، اس سے بہتر ہے وہ کسی شخص کی دوسری بیوی بن کر تحصینِ فرج، قضاء وطر اور غض بصر کا سامان کرے، اس میں عورت کا یہ فائدہ ہے کہ، مرد کے مال میں عورت کا استحقاق ہو جاتا ہے، اپنی ضرورتوں کی تکمیل میں وہ اب دوسروں کی محتاج نہیں ہوتی۔ شوہر والی ہونے میں دل کی مضبوطی بھی ہے. اور نہ کوئی ایرا غیرا اس پر اپنی قسمت آزماتا ہے۔ عورت کا دل بھی ڈانواں ڈول نہیں ہوتا۔ نیز شادی شدہ زندگی ایک باعزت زندگی ہے، لوگوں کی طرف سے لگنے والی بہت سی بدعنوانیوں سے حفاظت ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی مصلحتیں کثرتِ نکاح میں پوشیدہ ہیں، اسی وجہ حضرت ابن عباسؓ کا فرمان ہے جو بخاری شریف میں موجود ہے "خَيْرُ هَذِهِ الأُمَّةِ أَكْثَرُهَا النِّسَاءُ"، یعنی اس امت کا بہترین شخص وہ ہے جس کی بیویاں زیادہ ہوں۔

حضور ﷺ نے بھی متعدد مصلحتوں کی وجہ سے کئی نکاح کیے ہیں اسی طرح اکثر صحابہ ایک سے زیادہ بیویوں والے تھے۔

۱) لہذا آپ کا ایک بیوہ اور یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنے اور ایک نیک عمل پر اللہ واسطے عمل پیرا ہونے کی غرض سے دوسرا نکاح کرنا قابل مبارک باد اور ایک بہترین کار ثواب ہے۔

البتہ نابالغ بچیوں کے مشترکہ مالِ میراث سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ نکاح کے چند شرائط اور ذمہ داریاں ہیں، ان میں عدل و انصاف کے علاوہ سکنی یعنی دوسری بیوی کے رہنے کا انتظام کرنا بھی ہے۔ لہذا نکاح ثانی کے بعد نابالغ بچیوں کے مشترکہ دارِمتروکہ میں رہنا اور لائٹ، پانی اور دیگر اشیاء استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ لَا يَجُوزُ لِأَحَدٍ أَنْ يَتَصَرَّفَ فِي مِلْكِ الْغَيْرِ بِغَيْرِ إِذْنِهِ.

۲) دوسرے سوال کے جواب سے پہلے بھی بطور تمہید چند باتیں جان لیجیے؛ حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ أَحَقَّ الشُّرُوطِ أَنْ يُوفَىٰ بِهِ، مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ. (مسلم) یعنی پورا کرنے کے زیادہ سزاوار وہ شرط ہے جس کی وجہ سے تم نے شرم گاہوں کو حلال کیا۔یعنی عقدِ نکاح کے وقت جو شرائط طے کیے جائیں وہ زیادہ حق رکھتے ہیں اس بات کا کہ ان کو پورا کیا جائے۔

لیکن ضروری ہے کہ وہ شرائط مقتضائے عقد کے خلاف اور نکاح کے منافی نہ ہوں۔ بلکہ وہ شرائط مقتضائے عقد کے موافق اور مقاصد نکاح کے مناسب ہونے چاہیے۔مقتضائے عقد کے موافق جیسے: یہ شرط لگائے کہ میرے خاوند میرے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئیں، اور شرعی طریقہ پر میرا نان و نفقہ برداشت کریں گے اور میرے حقوق میں کوتاہی نہیں کریں گے، جس طرح دوسری بیوی کے لیے باری مقرر ہے میرے لیے بھی باری میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ اور مرد یہ شرط لگائے کہ عورت میری اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلے۔ اور میری نافرمانی نہ کرے اور میری اجازت کے بغیر کسی کو گھر میں آنے نہ دے وغیرہ۔

مقتضائے عقد کے مخالف شرائط جیسے: شوہر یہ کہے کہ میں باری مقرر نہیں کروں گا یا جماع نہیں کروں گا یا نفقہ نہیں دوں گا وغیرہ یا بیوی یہ شرط لگائے کہ میرے ساتھ جماع نہیں کریں گے، یا میرے اوپر سوتن نہیں لے کر آؤ گے۔ (شرح مسلم للنووی تحت ہذہ الحدیث الشریف)

دوسرے سوال کا جواب عرض ہے کہ، حقوق معاف کروانے کی شرط کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے لیکن مناسب نہیں ہے لھذا کوئی عورت اپنے شوہر کے ساتھ رات گزارنے کے حق سے

دست بردار ہو جائے تو اس کی گنجائش ہے نیز اگر بیوی نے اپنے حقوق معاف کرنے کے بعد حقوق کا مطالبہ کر لیا تو شوہر کے ذمہ اس کے حقوق ادا کرنا ضروری ہوگا، کیوں کہ بیوی کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاف کیے ہوئے حقوق کا دوبارہ مطالبہ کر لے۔ مطالبہ کے بعد رات گزارنے کی باری مقرر کرنا لازم ہوگا۔

البتہ بیوی کے نفقہ سے دست برداری کی شرط لگانا درست نہیں، نفقہ شوہر پر ہر حال میں لازم ہوگا۔

اب اگر ۲۰۱۰ء سے یعنی گزشتہ ۱۲ سالوں کا خرچہ پہلے سے نہ دار القضاء کی طرف سے متعین تھا اور نہ میاں بیوی نے آپس کی رضامندی سے طے کیا تھا تو ایسی صورت میں گزشتہ سالوں کا خرچہ شوہر پر لازم نہ ہوگا، عورت شوہر سے اس کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ اور اگر گزشتہ سالوں کا خرچہ پہلے سے دار القضاء کی طرف سے متعین تھا یا میاں بیوی نے اپنی رضا مندی میں کچھ طے کیا تھا تو ایسی صورت میں گزشتہ سات سالوں کا خرچہ دینا شوہر کے ذمہ قرض ہے۔ بیوی اس کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

وَإِذَا خَاصَمَتِ الْمَرْأَةُ زَوْجَهَا فِي نَفَقَةِ مَا مَضَى مِنَ الزَّمَانِ، قَبْلَ أَنْ يَفْرِضَ الْقَاضِي لَهَا النَّفَقَةَ، وَقَبْلَ أَنْ يَتَرَاضَيَا عَلَى شَيْءٍ، فَإِنَّ الْقَاضِي لَا يَقْضِيَ لَهَا بِنَفَقَةِ مَا مَضَى عِنْدَنَا۔ وَأَجْمَعُوا أَنَّهُ بَعْدَ فَرْضِ الْقَاضِي لَهَا النَّفَقَةَ، أَوْ بَعْدَ مَا تَرَاضَيَا عَلَى شَيْءٍ لِنَفَقَةِ كُلِّ شَهْرٍ، فَأَصْلُ الْمَسْأَلَةِ أَنَّ نَفَقَاتِ الزَّوْجَاتِ تَصِيرُ دَيْنًا بِقَضَاءِ الْقَاضِي أَوْ بِتَرَاضِيهِمَا عَلَى شَيْءٍ مَعْلُومٍ بِكُلِّ شَهْرٍ بِالِاتِّفَاقِ۔ (الْفَتَاوَى التَّتَارْخَانِيَّةُ لِلْإِمَامِ ابْنِ الْعَلَّاءِ ۵/۳۸۲)

إِنَّ هَذَا حَقٌّ خَاصٌّ بِالزَّوْجَةِ، وَإِذَا وَهَبَتْهُ أَصْبَحَ حَقًّا لِلْمَوْهُوبِ لَهُ بِدُونِ مَدْخَلٍ لِلزَّوْجِ فِيهِ، فَإِنْ شَاءَتْ أَخَذَتْهُ، وَإِنْ شَاءَتْ تَرَكَتْهُ۔

(كِتَابُ الْفِقْهِ عَلَى الْمَذَاهِبِ الْأَرْبَعَةِ لِعَبْدِ الرَّحْمَنِ الْجَزِيرِي ۲/۲۱۷)

۳) باری مقرر کرنے میں اور نان و نفقہ میں برابری لازم اور ضروری ہے اور ایسے شخص کے لیے دوسرا نکاح کرنا جائز ہی نہیں ہے جو ان چیزوں میں برابری نہ کر سکے اور حدیث شریف میں ہے کہ اگر جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ کسی ایک کی جانب جھک جائے تو قیامت کے دن

اس حال میں آئے گا کہ اس کی ایک جانب فالج زدہ ہو گی۔ (سنن ابی داود ۱۹۱۳) –اور نان نفقہ سے مراد وہ خرچہ ہے جو کہ شوہر پر لازم ہے اس میں اس کا کھانا پینا، رہائش اور کپڑوں کی ضروریات شامل ہیں۔ لہٰذا ان میں برابری لازم اور ضروری ہے۔ اور اس کی مقدار شرعاً کوئی مقرر نہیں اس کی مقدار کی تعیین عرف پر ہے، متوسط اعتبار سے خرچ کرنا شوہر پر لازم ہے۔ لہٰذا آپ اپنے علاقہ کے عرف کو دیکھتے ہوئے نفقہ مقرر کر سکتے ھیں۔ آمدنی میں سے آدھی ایک بیوی کو اور دوسری آدھی دوسری بیوی کو دینا ضروری نہیں ہے نہ ہی کسی بیوی کا مطالبہ درست ہے۔ اور جہاں آپ کے بچے ہیں وہاں آپ ان بچوں کے لیے زیادہ پیسے دے سکتے ہیں۔

برابری صرف رات گزارنے اور نفقہ سکنی میں ہے، اس کے علاوہ جماع، بوسہ، دن میں وقت گزارنا وغیرہ میں برابری مستحب و پسندیدہ ہے۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ کوئی شخص ایک عورت ہی سے جماع کرے اور دوسری یکسر چھوڑ دے۔

———

عمرہ اور زیارت کے فضائل

سوال: عمرہ اور زیارت مدینہ و روضۂ رسول کے فضائل ارسال کریں؟

جواب: عمرہ کے فضائل: حضرت نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد چار عمرے کیے، ایک عمرۂ صلح حدیبیہ دوسرا عمرۂ قضا تیسرا فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے بعد جعرانہ سے عمرہ اور چوتھا حجۃ الوداع کے ساتھ۔

ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ حج کے لیے مستقل سفر کرنا اور عمرہ کے لیے علیحدہ سفر کرنا فقر کو ختم کرتا ہے۔ لہذا یہ آپ نے کہیں نہیں سنا ہوگا کہ جو بکثرت حج اور عمرہ کا سفر کرتا ہو وہ تنگ دستی میں مبتلا ہوگیا ہو اور فاقوں کی نوبت آگئی ہو۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَابِعُوا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوبَ، كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ.

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جن کی دلی چاہت پر کئی بار آسمان سے حکم اترا ہے جن کے بارے میں فرمایا گیا حق عمر کے دل و زبان پر جاری ہوگیا ہے انھوں نے اپنے عہد خلافت میں حج تمتع (یعنی حج کے سفر میں عمرہ کرنا) کرنے سے منع فرمادیا تھا تا کہ لوگ حج افراد کریں اور عمرہ کے لیے مستقل سفر کرکے آئیں، جس سے ایام حج کے علاوہ بھی مسجد حرام معتمرین اور طواف کرنے والوں سے آباد رہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے جب سن چھ ہجری میں خواب دیکھا کہ صحابہ حلق کروا رہے ہیں، کعبہ شریف کا طواف کر رہے ہیں اور آپ نے یہ خواب صحابہ کو بیان کیا تو (چوں کہ نبی کا خواب بھی وحی قطعی ہوتا ہے) تمام صحابہ سفر عمرہ کے لیے بے قرار ہوگئے، آپ ﷺ نے بھی صحابہ کی بے کلی کو دیکھتے ہوئے عمرہ کا سفر فرمایا۔ (باوجود اس کے کہ اس خواب میں سال کی تعیین نہیں تھی)

رمضان میں عمرہ کرنے کی ترغیب حضرت نبی کریم ﷺ نے یہ کہہ کر دی ہے کہ رمضان کا عمرہ حج کی طرح ہے۔

اور حضرت ابرہیم علیہ السلام کی دعا اجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِم کی برکت سے لوگوں کے دل اس بابرکت سرزمین کی طرف کھچیں ہوئے ہیں۔ اور اس دعا کے اندر یہ اشارہ بھی ہے کہ لوگوں کو اپنے دلوں کا میلان اس پاک بابرکت زمین کی طرف کرنا چاہیے۔

ان تمام باتوں سے یہ باور کرانا مقصود ہے کہ عمرہ کے لیے مستقل سفر کرنا ایک اہم قربت، صحابہ اور ان کے اتباع کا توارث اور لائقِ تقلید عمل، قابلِ عمل حکم اور باعثِ ثواب و برکت سنت ہے۔

عربوں میں اس کا کافی رواج اور چلن ہے، جزیرۃ العرب کے اسکولوں کی تعطیلات میں تو حرم پاک میں کافی رش اور ازدحام نظر آتا ہے۔ برصغیر اور انڈو و ملائی کے بھی کافی معتمرین و زائرین ہوتے ہیں، البتہ ہند و پاک میں جیسا التفات ہونا چاہیے وہ ناپید ہے۔

صَحِيحُ الْبُخَارِيِّ حَدَّثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ يُوسُفَ، أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ سُمَيٍّ، مَوْلَى أَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمَنِ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ السَّمَّانِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ۔

حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، حَدَّثَنَا يَحْيَى، عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ عَطَاءٍ، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، يُخْبِرُنَا، يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِامْرَأَةٍ مِنَ الْأَنْصَارِ - سَمَّاهَا ابْنُ عَبَّاسٍ فَنَسِيتُ اسْمَهَا -: مَا مَنَعَكِ أَنْ تَحُجِّي مَعَنَا؟ قَالَتْ: كَانَ لَنَا نَاضِحٌ، فَرَكِبَهُ أَبُو فُلَانٍ وَابْنُهُ، لِزَوْجِهَا وَابْنِهَا، وَتَرَكَ نَاضِحًا نَنْضَحُ عَلَيْهِ۔ قَالَ: فَإِذَا كَانَ رَمَضَانُ فَاعْتَمِرِي فِيهِ، فَإِنَّ عُمْرَةً فِي رَمَضَانَ حَجَّةٌ، أَوْ نَحْوًا مِمَّا قَالَ.

اس حدیث میں رمضان کے عمرہ کو حج کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

جمہور علماء کے نزدیک عمرہ کثرت سے کرنا مستحب ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال میں ایک سے زائد مرتبہ عمرہ کرایا اور خود عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعد میں بھی ایک سال کے اندر دو تین عمرے کئے ہیں۔

زیارت مدینہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

علماء وصلحاء کا عمل متوارث رہا ہے کہ وہ حج یا عمرہ کی ادائیگی کے بعد روضہ مبارک کی زیارت کے لیے مدینہ کا سفر کرتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے حج کیا پھر میری قبر کی زیارت کی تو گویا کہ اس نے مجھے میری زندگی دیکھا ہے۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوعًا: مَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِي بَعْدَ وَفَاتِي، فَكَأَنَّمَا زَارَنِي فِي حَيَاتِي. (مِشْكَاةُ الْمَصَابِيحِ) (تَكَلَّمَ فِيهِ الْعُلَمَاءُ فِي صِحَّتِهِ)

زیارت قبر اطہر کے بارے میں مستقل علماء نے کتابیں لکھی ہیں ں، اس کی فضیلت کو اور اس کے لیے سفر کرنے کی فضیلت کو ثابت کیا ہے۔

اہلِ سنت و الجماعت (بشمول ائمہ اربعہ رحمہم اللہ) کا اجماعی عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف میں زمین کا جو حصہ رسول اللہ ﷺ کے جسمِ اطہر اور اعضاءِ مبارکہ سے ملا ہوا ہے زمین کا وہ حصہ اور ٹکڑا کعبہ (بیت اللہ)، عرش اور کرسی سب چیزوں سے افضل ہے۔

یہ سفر اس وجہ سے بھی فضیلت کا حامل ہے کہ وہاں مسجد نبی ﷺ بھی ہے، جس میں نماز پڑھنے کی فضیلت ہزار درجہ بڑھی ہوئی ہے، ایک روایت میں چالیس نمازیں تکبیر اولی کے ساتھ پڑھنے کی فضیلت آئی ہے کہ نفاق اور جہنم سے چھٹکارے کا پروانہ دیا جاتا ہے،

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهُ قَالَ: مَنْ صَلَّى فِي مَسْجِدِي أَرْبَعِينَ صَلَاةً لَا يَفُوتُهُ صَلَاةٌ، كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ، وَنَجَاةٌ مِنَ الْعَذَابِ، وَبَرِيءٌ مِنَ النِّفَاقِ. (شعیب الأرنؤوط: إسنادہ ضعیف لجہالۃ نبیط بن عمر (۳/۱۵۵)

اس مسجد میں ایک حصہ ہے جس کو جنت کا باغیچہ کہا گیا (میرے ممبر اور قبر / بیت کے درمیان جو قطعۂ زمین ہے وہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے) بعض علماء نے اس کو حقیقت پر محمول کیا کہ یہ حصہ جنت سے اتارا گیا ہے، بعض حضرات اس کو تمثیل قرار دیتے ہیں، کسی بھی مسجد/ عمارت کی فضیلت اس کے بانی کی وجہ سے ہوتی ہے یا اس میں عبادت کرنے والوں کی وجہ سے، مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصی اور مسجد قباء کی فضیلت اس وجہ سے ہے کہ اس کے بانی انبیاء ہیں اور ان مسجدوں میں انبیاء اپنے اپنے وقتوں میں عبادت بھی انجام دی ہے تو چوں کہ ریاض الجنۃ کو حضرت نبی کریم ﷺ کی طویل مدت کی عبادت کا شرف حاصل ہے تو گویا وہ جنت کی کیاری ہے۔

یہ سفر اس وجہ سے بھی باعث خیر و برکت اور قابل شرف و منزلت ہے کہ وہاں "مدینہ"، "شہر رسول ﷺ" ہے، جس کو ہجرتِ رسول ﷺ سے پہلے یثرب کہا جاتا تھا پھر اسے مدینۃ الرسول اور "المدینہ" کہا جانے لگا، حضرت نبی کریم ﷺ نے اسے اور بھی کئی نام دیے جیسے "طابہ، طیبہ"۔ حضرت نبی کریم ﷺ کو مدینہ سے اس قدر محبت تھی کہ اس کے پہاڑ سے بھی محبت فرماتے اور

کہتے جبلِ احد ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں، آپ نے مدینہ منورہ میں برکت کے لیے وہی دعائیں کی جو حضرت ابرہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کے لیے کی تھی بلکہ آپ نے اس سے ڈبل برکت کی دعا فرمائی، حتی کے اہل مدینہ کے صاع اور مد میں بھی برکت کی دعا فرمائی۔

مکہ مکرمہ کی حدود حرم ہیں وہ محترم بقعہ ہے، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لیے حرم مقرر کیا، آپ نے ایک مرتبہ کہا کہ مدینہ بھٹی کی طرح ہے جو خالص چیز کو باقی رکھتا ہے اور میل کچیل کو دور کرتا ہے، آپ نے مدینہ منورہ کے بارے میں یہ بھی پیشن گوئی کی کہ مدینہ میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہوں گے، اور قرب قیامت ایمان مدینہ میں اس طرح سمٹ جائے گا جیسے سانپ اپنے بل میں سمٹ جاتا ہے، (یعنی اس کا کوئی حصہ بل کے باہر نہیں رہتا،) آپ نے یہ بھی کسی وقت فرمایا کہ جو شخص اس بات کی استطاعت رکھتا ہے کہ وہ مدینہ میں مرے تو چاہے کہ وہ ایسا کرے، میں اس کے لیے سفارش کروں گا۔ اسی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دعا فرماتے اے اللہ اپنے رسول کے شہر میں شہادت کی موت عطا فرما اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ سے باہر جانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ (مذکورہ حدیثیں صحیح سند سے ثابت ہیں)

زیارت کی فضیلت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ ہم صیغۂ خطاب سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلاۃ و سلام پیش کرتے ہیں، اَلصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ، اَلصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَبِيبَ اللهِ، اَلصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَيْرَ خَلْقِ اللهِ. اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سنتے ہیں اور جواب مرحمت فرماتے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں یہ بھی ہے: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هَذَا، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى. (ترمذی)

یعنی سواریوں کو کسی (عبادت کی نیت سے) سفر کے لیے تیار نہ کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف: مسجدِ حرام، میری یہ مسجد (مسجدِ نبوی)، اور مسجدِ اقصیٰ۔

———

ساس سسر کی خدمت

سوال: کیا بیوی پر ساس کی خدمت واجب ہے؟ والدین کی خدمت کس کے ذمہ ہے؟ شوہر کے ذمہ والدین کی اطاعت کرے یا اپنی بیوی کی؟ شوہر کا اپنی بیوی کو چھوڑ کر بغرض خدمت والدین کے پاس سونے کا کیا حکم ہے؟ بوڑھے والدین کے اخراجات کس کے ذمہ ہیں؟

جواب: آپ کے سوالات کے الگ الگ جوابات دینے سے پہلے دین کی ایک اصولی تعلیم اور ہدایت پیش کی جاتی ہے۔ اس کو ذہن نشیں کر لیں:

شریعت میں ہر شخص کو اس بات پر متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرے، حقوق کے مطالبہ پر زور نہیں دیا گیا ہے۔ آج کی دنیا حقوق کے مطالبہ کی دنیا ہے، ہر شخص اپنا حق مانگ رہا ہے اور اس کے لیے مطالبہ کر رہا ہے گویا کہ اپنا حق مانگنے اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے کے لیے دنیا بھر کی کوششیں کی جارہی ہیں اور اس کے لیے باقاعدہ انجمنیں قائم کی جارہی ہیں لیکن آج ادائیگیٔ فرض کی کسی بھی شخص کو فکر نہیں کہ جو فرائض و ذمہ داریاں میرے ذمہ عائد ہیں وہ ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ مرد کہتا ہے مجھے میرے حقوق ملنے چاہیے۔ عورت کہتی ہے میرے حقوق ادا کیے جائیں، ساس سسر کہتے ہیں ہمارا حق ہمیں دیں، اور اس کے لیے کوششیں اور جد وجہد جاری ہے، کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ جو فرائض میرے ذمہ عائد ہیں وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف توجہ کرے۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض ادا کرنے لگے تو سب کے حقوق ادا ہو جائیں، شوہر اگر اپنے فرائض ادا کرے تو بیوی کا حق ادا ہو گیا اور بیوی اگر اپنے فرائض ادا کرے تو شوہر کا حق ادا ہو گیا، شریعت کا اصل مطالبہ یہی ہے کہ تم اپنے فرائض ادا کرو۔ والدین اپنے فرائض ادا کریں اور اولاد اپنے۔

آج ہمارے زمانے میں عجیب الٹی گنگا بہنی شروع ہو گئی ہے کہ جب کوئی شخص اصلاح کا جھنڈا اٹھاتا ہے تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرا شخص اپنی اصلاح کا آغاز کرے، اپنی فکر نہیں کہ میرے اندر بھی کچھ کوتاہی ہے، میں بھی غلطی کا شکار ہوں میں اس کی فکر کروں حالاں کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ. اے ایمان والو اپنے آپ کی فکر کرو کہ تمھارے ذمہ کیا فرائض ہیں؟

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے تم سے کیا مطالبات ہیں؟ شریعت دیانت، امانت اور اخلاق کے تم سے کیا مطالبات ہیں، ان مطالبات کو بجالاؤ، دوسرا شخص اگر گمراہی میں مبتلا ہے اور اپنے فرائض انجام نہیں دے رہا ہے تو اس کا نقصان تمھارے اوپر نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ تم اپنے فرائض صحیح طور سے انجام دے رہے ہو۔

شریعت میں سارا زور اس بات پر ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگہداشت کرے، حضور اکرم ﷺ نے صالح معاشرہ کے قیام کے لیے امت کی جو رہنمائی فرمائی ہے، وہ ایسی واضح اور مکمل ہے کہ اگر اس کو پورے پورا عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ایک صالح اور معیاری معاشرہ قائم ہوگا بلکہ کسی کو کسی سے شکایت کا کوئی موقع نہیں رہے گا۔ آج کل لوگوں نے لینے اور دینے کے بہانے الگ الگ معیار بنا رکھے ہیں، اور یہی مزاج سارے فساد کی جڑ ہے، مثال کے طور پر جب بیٹے کا نکاح کرواکر بہو گھر لائی جاتی ہے تو بیٹے کے ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہو پر بیٹے کا حق ان کے بعد میں ہے اور ہمارا حق پہلے ہے۔ لہذا یہ بہو بیٹے کی خدمت کرے یا نہ کرے ہماری خدمت ضرور کرے۔ بیٹے کی اطاعت کرے یا نہ کرے ہماری اطاعت ضرور کرے حالاں کہ ان کا یہ نظریہ ہی بنیادی طور پر غلط اور اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ پھر مزید طرہ یہ ہے کہ یہی ماں باپ اپنی بیٹی کا نکاح کرواکر دوسرے کے گھر بھیجتے ہیں، اس وقت ان کی سوچ یہ نہیں ہوتی وہاں تو ان کی بھی دلی تمنا اور خواہش بلکہ اس کے لیے سر توڑ کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہمارا داماد اپنی بیوی یعنی ہماری بیٹی کو لے کر الگ گھر آباد کرے، جہاں ہماری بیٹی کو اپنے ساس، سسر کی خدمت نہ کرنی پڑے حالاں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔'' اپنی اغراض اور مفادات ہی کو بنیاد قرار دے کر ہر آدمی دوسرے کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالی اور حضور ﷺ نے جو احکامات دیے ہیں اس کو بنیادی حیثیت دینے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ مزید براں رسم و رواج نے لوگوں کے دل و دماغ پر ایسا تسلط جما رکھا ہے کہ اچھے اچھے دیندار لوگ بھی اس کے سامنے سپر ڈال دیتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ قدم قدم پر شریعت مطہرہ کے معاشرتی احکام و ہدایات کی خلاف ورزی میں کوئی باک محسوس نہیں کیا جاتا۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات پیشی ہیں:

(۱) حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں: ''ایک بات اور سمجھ لیجے جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے، وہ یہ کہ جب عورت کے ذمہ شوہر کا اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں، تو شوہر کے جو ماں باپ اور بہن بھائی ہیں ان کے لیے کھانا پکانا اور ان کی خدمت کرنا بطریقِ اولی واجب نہیں۔ ہمارے یہاں یہ دستور چل پڑا ہے کہ جب بیٹے کی شادی ہوئی تو اس بیٹے کے ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہو پر بیٹے کا حق بعد میں ہے اور ہمارا حق پہلے ہے، لہذا یہ بہو ہماری خدمت ضرور کرے چاہے وہ بیٹے کی خدمت کرے یا نہ کرے اور پھر اس کے نتیجے میں ساس، بہو، بھاوج اور نندوں کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور جھگڑوں کے نتیجہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ خوب سمجھ لیں کہ اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہے تو لڑکے کے ذمہ واجب ہے کہ وہ خود ان کی خدمت کرے، البتہ اس لڑکے کی بیوی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت بھی خوش دلی سے اپنی سعادت اور باعث اجر سمجھ کر انجام دے، لیکن لڑکے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت کرنے پر مجبور کرے جب کہ وہ خوش دلی سے ان کی خدمت پر راضی نہ ہو اور نہ والدین کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی بہو کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ ہماری خدمت کرے۔ لیکن اگر وہ بہو خوش دلی سے اپنی سعادت مندی سمجھ کر اپنے شوہر کے والدین کی جتنی خدمت کرے گی ان شاء اللہ اس کے اجر میں بہت اضافہ ہوگا، اس کو ایسا کرنا بھی چاہیے تا کہ گھر کی فضا خوش گوار رہے، لیکن ساتھ ہی دوسری جانب ساس، سسر اور شوہر کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر یہ خدمت انجام دے رہی ہے تو یہ اس کا حسن سلوک ہے اُس کا حسن اخلاق ہے اس کے ذمہ خدمت فرض و واجب نہیں۔ لہٰذا ان کو چاہیے کہ وہ بہو کی اس خدمت کی قدر کریں اور اس کا بدلہ دینے کی کوشش کریں، ان حقوق اور مسائل کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں آج گھر کے گھر برباد ہو رہے ہیں، ساس بہو کی اور بھاوج اور نندوں کی لڑائیوں نے گھر کے گھر اجاڑ دیے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ ان حقوق کی وہ حدود جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں وہ ذہنوں میں موجود نہیں ہیں۔'' (اصلاحی خطبات ۲/۵۰)

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: ''بعضے آدمی اس کو بڑی سعادت مندی سمجھتے ہیں کہ ہیں کہ اپنی بیوی کو ماں کا محکوم ومغلوب بنا کر رکھیں، اور اس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے

ظلم ہوتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہیے کہ بی بی پر فرض نہیں کہ ساس کی خدمت کیا کرے، تم سعادت مند ہو خود خدمت کرو، خدمت کے لیے نوکر لاؤ۔ (اصلاح انقلاب امت (۲/۱۸۸) بحوالہ محمود الفتاوی ۱۰۶/۳)

اسلام انسانی رشتوں میں باہمی محبت، احترام، وفا، خلوص، ہم دردی ایثار عدل، احسان اور باہمی تعاون کا درس دیتا ہے، میکا ہو یا سسرال دونوں اپنی جگہ محترم اور ان دو جگہوں سے وابستہ رشتے بھی لائق احترام اور انسان کی بنیادی ضرورت نکاح سے وابستہ ہیں، میاں بیوی میں سے ہر ایک دونوں گھرانوں کی تنظیمی عمارت کا بنیادی ستون ہیں۔ پس شریعت مطہرہ نے میاں بیوی میں سے ہر ایک کو اخلاقاً ایک دوسرے کے بڑوں کے ساتھ حسن سلوک و احترام کرنے کا پابند کیا ہے، تاہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی ایک دوسرے کے والدین و دیگر سسرالیوں کی خدمت کا اس طور پر پابند نہیں کیا کہ اگر خدمت نہ کی تو وہ گناہ گار ہوں لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنے حقیقی والدین کی طرح اپنے ساس سسر کی عزت و احترام کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت بھی کریں تو یہ ان کے لیے دنیا میں باعث خیر و برکت اور آخرت میں اجر و ثواب کا باعث ہوگا، اسی طرح ساس بھی اپنی بہو اور داماد پر اپنی حقیقی بیٹی اور بیٹے کی طرح شفقت کریں ان کے ساتھ پیار و محبت اور رعایت سے پیش آئیں تو گھر کا ماحول بھی خوش گوار ہو گا۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند)

(۲) ماں، باپ کے حقوق شریعت میں بہت ہیں اور ماں باپ کی کفالت و خدمت ان کے بچوں اور بچیوں پر برابر واجب ہے کہ وہ ان کی خدمت و اطاعت کریں اور بیمار ہیں تو تیمار داری کریں۔ اگر وہ خود نہیں کر سکتے تو ملازم / ملازمہ کا انتظام کریں۔ اور ضعیف والدین کو بھی چاہیے کہ حتی الامکان اپنے کام خود انجام دیں، اللہ کے علاوہ کسی اور کی محتاجگی سے حفاظت مانگتے رہیں۔

(۳) شریعت مطہرہ نے ماں باپ اور بیوی دونوں کو علیحدہ حیثیت اور مرتبہ دیا ہے اور دونوں کے علیحدہ حقوق مقرر کیے ہیں، اس طور پر کہ دونوں کے مرتبہ اور مقام کو سمجھ کر اگر کوئی شخص ان کے حقوق کی بجا آوری کرے تو کبھی ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہونے کی نوبت ہی نہ آئے، بس اتنا سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ رب العزت نے ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی اطاعت و فرماں برداری کو بھی لازم قرار دیا ہے، جب کہ بیوی کے صرف حقوق کی ادائیگی لازم ہے، نہ کہ اس کی اطاعت شعاری و فرماں برداری، بلکہ بیوی کے ذمہ لازم ہے کہ اپنے شوہر کی مطیع و فرماں بردار بن کر رہے۔

احترام دونوں (والدین اور بیوی) ہی کو اپنے مرتبہ کے لحاظ سے حاصل ہے اور ذمہ داریاں بھی دونوں سے متعلق الگ الگ ہیں۔ لھذا شوہر کو والدین اور بیوی کے ساتھ اعتدال کا معاملہ رکھنا چاہئے۔

(۴) مرد کا اپنی بیوی کے ساتھ سونا سنت ہے حضرت نبی کریم ﷺ بھی اپنی بیویوں کے ساتھ رات گزارتے تھے عذر کے بغیر مرد کو بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ اگر والدین نہایت ضعیف ہوں کہ رات میں ان کے پاس کسی نہ کسی کا ہونا ضروری ہو تو بچے اور بچیاں والدین کے سونے کی ترتیب بنا دیں یا کسی ملازم / ملازمہ کا انتظام کر لیں۔

وَأَنَّ السُّنَّةَ أَنْ يَبِيتَ الرَّجُلُ مَعَ أَهْلِهِ فِي فِرَاشٍ وَاحِدٍ، وَلَا يَجْرِيَ عَلَى سَنَنِ الْأَعَاجِمِ، مِنْ كَوْنِهِمْ لَا يُضَاجِعُونَ نِسَاءَهُمْ، بَلْ لِكُلٍّ مِنَ الزَّوْجَيْنِ فِرَاشٌ، مَتَى احْتَاجَهَا أَتَاهَا أَوْ أَتَتْهُ. (نقص القدیر شرح جامع الصغیر ۳۹۱)

شریعت میں ہر ایک پر اپنے اعزہ و اقارب کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے پھر اپنے حسب استطاعت وہ دنیا جہاں کے دوسرے لوگوں کی خدمت کر سکتا ہے، البتہ حقوق کی ادائیگی میں ترجیحات طے ہیں لھذا علماء نے لکھا ہے: کہ مرد پر ماں باپ اور بیوی دونوں کے حقوق واجب ہیں لہذا دونوں کے حقوق ادا کرے کسی کی حق تلفی نہ کرے البتہ تعارض کی صورت میں ماں باپ کو بیوی پر مقدم رکھے، البتہ ماں باپ کے خلاف شرع حکم کو نہ مانے۔ اسی طرح ماں باپ پر بھی بچوں کے حقوق ہیں ہر ایک کو اپنے حقوق کے مطالبہ کے بجائے ادائیگی کی زیادہ فکر ہونی چاہئے۔ حدیث میں ہے "تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے یعنی دوسرے کے حق اسپر نکلتے ہیں اور اس کے بارے میں ہر ایک سے پوچھا جائے گا۔

(۵) بوڑھے ماں باپ اگر نفقے (خرچہ) کے محتاج ہوں تو ان کا خرچہ بیٹے پر اس کی استطاعت کے مطابق معروف طریقے پر لازم ہے اگر ایک بیٹا ہے تو اسی کے ذمہ ہوگا، ایک سے زائد ہیں تو ان پر تقسیم ہوگا، جہاں تک خدمت اور حسن سلوک کی بات ہے تو اگر والدین خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بیٹے اور بیٹی دونوں پر ہے اور دونوں پر برابر برابر واجب ہے۔ یہاں تک کہ جب بیٹی کی رخصتی ہو جائے تو اس کے لیے بھی یہ حکم ہے کہ وقتاً فوقتاً والدین کی خبر گیری کرتی رہے۔

قرآن خوانی کا شرعی طریقہ

سوال: قرآن خوانی کا طریقہ اور میت کے قریب قرآن کی تلاوت کرنے کا حکم۔

جواب: قرآن مجید کی تلاوت ایک بڑی عبادت ہے، اور اسے پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا فی نفسہ درست اور مستحسن ہے، مگر آج کل قرآن خوانی کا جو طریقہ رائج ہے اس میں بہت سے مفاسد پائے جاتے ہیں. لہذا چند شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(الف) قرآن خوانی کے لیے ایک جگہ جمع نہ ہوا جائے۔ بلکہ ہر شخص انفرادی طور پر قرآن کریم کی تلاوت کرے۔

(ب) جو شخص جتنا آسانی کے ساتھ پڑھ سکے وہ اتنا پڑھے۔

(ج) جس شخص نے پڑھنے کا کہا ہے اس کے سامنے یا دوسروں کے سامنے ظاہر نہ کیا جائے کہ کتنا پڑھا ہے۔

(ہ) قرآن کریم پڑھنے والوں کی نیت محض رضائے الٰہی ہو اور تلاوت صحیح کی جائے۔

(و) قرآن کریم کی تلاوت وختم قرآن کے لیے تداعی (ایک دوسرے کو بلانا، دعوت دینا) اور اعلان سے احتراز کیا جائے۔

(ماخوذ از فتاوی قاسمیہ ۱۰/۲۲۶ اور مروجہ قرآن خوانی کی شرعی حیثیت از مفتی عبد الرؤوف سکھروی)

مذکورہ شرائط کے پیش نظر پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایصالِ ثواب کے لیے خاندان والوں، محلوں میں دیگر لوگوں کو (یہی حکم واٹس ایپ گروپ کا ہے) پارے تقسیم کر کے ختم قرآن کرنا۔ ایصالِ ثواب کا یہ طریقہ خلاف معہود ہے نبی کریم ﷺ اور صحابہ و تابعین کے درمیان اس کا معمول نہیں تھا۔ میت کے لیے ایصالِ ثواب کے لیے ضروری نہیں کہ پورا قرآن کریم ہی ختم کیا جائے۔ لھذا بہتر یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر اپنے اعتبار سے ایصالِ ثواب کر لیں۔ مذکورہ بالا شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر پارے تقسیم کر کے ایصالِ ثواب کر لیا گیا یا اتفاقاً خاندان والے جمع ہو گئے تھے اور وہاں موجود لوگوں نے مل کر قرآن خوانی کر لی تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

(۲) باقاعدہ قرآن خوانی کے لیے جمع کرنا درست نہیں ہے البتہ اتفاقیہ لوگ جمع ہو گئے اور قرآن کریم پست آواز سے پڑھ رہے ہوں؛ تو تفصیل یہ ہے کہ اگر میت کو غسل نہیں دیا ہے لیکن میت کو مکمل کپڑے سے ڈھانکا ہوا ہے تو اس کے پاس قرآن مجید پڑھنے میں کوئی حرج نہیں

ہے۔خواہ قرآن کریم اٹھا کر تلاوت کی جائے یا بغیر اٹھائے زبانی تلاوت کی جائے۔اور اگر میت کو کپڑے سے ڈھانکا نہ گیا ہو تو پھر غسل دینے سے پہلے میت کے قریب تلاوت کرنا مکروہ ہے۔ البتہ تسبیح وغیرہ پڑھی جاسکتی ہے۔اور میت کو غسل دینے کے بعد خواہ میت کے قریب تلاوت کی جائے یا دور بہرصورت جائز ہے۔

شامی میں ہے : وَالظَّاهِرُ أَنَّ هٰذَا أَيْضًا إِذَا لَمْ يَكُنِ الْمَيِّتُ مُسَجًّى بِثَوْبٍ يَسْتُرُ جَمِيعَ بَدَنِهِ، لِأَنَّهُ لَوْ صَلَّى فَوْقَ نَجَاسَةٍ عَلَى حَائِلٍ مِنْ ثَوْبٍ أَوْ حَصِيرٍ لَا يُكْرَهُ بِمَا يَظْهَرُ، فَكَذَا إِذَا قَرَأَ عِنْدَ نَجَاسَةٍ مَسْتُورَةٍ. (۲/۱۹۳)

البتہ قرآن خوانی کی وجہ سے تدفین میں تاخیر نہیں کی جائے گی، حدیث شریف میں ہے کہ مسلمان کی نعش کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اس کو اس کے گھر والوں کے درمیان روکا جائے۔

(رواہ ابوداؤد)(ماخوذ از فتاوی قاسمیہ ۱۰/۶۳۱)

اے غزہ تو ہم سے کیا چاہتا ہے؟

(یہ کسی نے سوال نہیں کیا۔ تصاویر اور ویڈیوز دیکھ کر یہ میرے دل نے سوال کیا جس کا جواب قلم نے دیا)

ہم اپنی زندگی کے تانے بانے بننے میں مصروف تھے۔ اپنی دنیا میں مست تھے۔ ہنسنے ہنسانے کی محفلیں ہمیں اچھی لگتی تھیں۔ گھومنا، سیر کرنا، دل کو بھاتا تھا۔عمدہ لذیذ غذائیں دسترخوان پر سجی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔

اے غزہ۔۔۔۔۔!اے غزۃ العزۃ

تیری مٹی پر بہتا ہوا لہو، تیری فضاؤں میں گونجتی چیخیں، تیری ماؤں کے چہروں پر جمی ہوئی درد کی لکیریں اور تیری معصوم کلیوں کی لاشیں۔۔۔ یہ سب ہم سے سوال کرتی ہیں۔

''اے امتِ محمد ﷺ! تم کہاں ہو؟''

تو ہمیں کس جرم کی سزا دے رہا ہے؟ کیوں تو نے ہماری عزت پامال کر دی ہے؟ کیوں تو نے ہمیں ہمارے اندر بے وقعت کر دیا ہے؟ ہم اس ذلیل جثہ کو لے کر کہاں جائیں؟ انصاف پسند برادر وطن کوستے ہیں۔تم اپنے بھائیوں کے لیے کیا کر رہے ہو؟

ان سب کا ذمہ دار تو ہے غزہ. کیوں تو نے ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال دیا؟ کیوں تو نے ہماری منافقت واکر دی؟ کیوں تو نے ہماری محبین پھیکی اور کھانے کا مزہ پھیکا کر دیا۔

ہم دیکھ رہے ہیں۔۔۔ ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں رہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں بچوں کی خوب صورت آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں لمبی قطاریں کھانے سے محروم بچے لوٹ رہے ہیں۔

عورتیں اور بچیں چیخ رہے ہیں۔ اپنے رب کو پکار رہے ہیں کہ نہ کھانا ہے نہ پانی۔ ہم کو اے ہمارے رب !جنت میں ٹھکانا دے کہ وہاں کھانا نصیب ہو۔

اے غزہ۔۔۔۔۔ اے غزۃ العزۃ

یہ سب دکھا کر تو چاہتا کیا ہے؟

تو ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے دل کی سستی اور اپنی رگوں کی بے غیرتی کو جھنجھوڑ ڈالیں۔ تو چاہتا ہے کہ ہم اپنے ایمان کو عمل کی روشنی میں ڈھالیں۔ ہم اپنے قدموں کو بزدلی کے بوجھ سے آزاد کریں۔اور اپنے لہو کو تیرے لہو کے ساتھ ملا کر ظلم کے ایوانوں کو ہلا ڈالیں۔

غزہ شاید تیری دستک غلط جگہ پر پڑ رہی ہے۔ ہم یہ سب حالات دیکھ کر صرف موبائل کی اسکرین ہی اوپر کو ہلا سکتے ہیں۔ ایک پل کو ہم تیرے درد کو محسوس کرتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے ہماری زندگی کی تابناکیاں ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ ہم اپنے پیٹ کا پانی نہیں ہلا سکتے۔ ظلم کے ایوان تو ہم نے خود آباد کیے ہیں۔

اے غزہ ظلم کے ایوان تیرے فرزندان ہلا چکے ہیں۔ ہم سوچتے تھے کہ حضرت عیسی علیہ السلام آئیں گے تو سب عیسائی کیوں کر ایمان لے آئیں گے؟ کیا یہ بات عقل میں سما جانے والی ہے؟ اور یہودیوں کا قتل عام دنیا کے لوگ کس طرح برداشت کریں گے؟ لیکن اے غزہ تو نے ساری دنیائے عیسائیت کو بتایا کہ حق پرست محبوب کون ہیں اور باطل پرست مغضوب کون ہیں؟ عیسائی دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے۔ جہاں اے غزہ تیرے لیے لوگ جمع نہ ہوئے ہوں۔ تیرے حق میں آواز نہ اٹھائی ہو۔

لیکن افسوس تیرے اپنوں نے تجھے چھوڑ دیا۔ آل سعود بے بہبود یہود کی گود میں بیٹھ گیا۔ امارات نے ابوت کا رشتہ یہود سے جوڑ دیا اور مصر نے بھائی چارگی قائم کر لی۔ زبانی جمع خرچی اور منہ سے تھوک اڑانے کے علاوہ ہمارے پاس تیرے لیے اے غزہ! صرف یہ موبائل ہے۔ جس سے ہم کچھ تیری جھلکیاں دیکھ پاتے ہیں۔ کچھ سرسری سا لکھ پاتے ہیں۔

لیکن اے غزہ قرآن کی پکار ہے۔ اللہ تعالی مومنوں کو ہی غالب کرتے ہیں۔ باطل مٹنے ہی کے لیے ہے۔ اس کی کوششیں بالآخر محض ناکام پھونکیں ثابت ہوتی ہیں۔ طائفہ کے منصورہ ہونے کی خبر سنت نے ہم کو دی ہے۔ نبی آخر الزماں کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ مدد اور نصرت خداوندی شامل حال ہے۔

لوگ سمجھ رہے ہیں یہ غزہ کی آخری سسکیاں ہیں۔ یہ غزہ کا دم واپسیں ہے لیکن نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے یہ غزہ اے! غزۃ العزۃ! یہ تیرا دوبارا اٹھ کھڑے ہونے کا وقت ہے۔ یہ نصر اللہ کی آمد آمد کا وقت ہے۔ ڈرنا ان لوگوں کو چاہیے جو برما کے حالات سے سبق نہ سیکھ سکے۔ جنہوں نے افغانستان کی کارگزاری سے کچھ نہ سیکھا۔ عراق اور شام کی اہل سنت خواتین کی چیخیں ان کو بیدار نہ کر سکیں، حالاں کہ گردش زمانہ ان کے سر پر منہ پھاڑے کھڑا ہے، موت کی کالی پرچھائیاں سایہ فگن ہیں، سخت حالات کے تیور انھیں آنکھیں دکھا رہا ہے۔ اور وہ خاموش تماشائی بن کر مطمئن ہیں، وہ سمجھتے ہیں ہم جمہوریت بچا کر خود کو محفوظ کر لیں گے۔

انسٹاگرام اور مسلمان

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ.

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ: مَنۡ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً فَلَہُ أَجۡرُھَا، وَأَجۡرُ مَنۡ عَمِلَ بِھَا إِلَیٰ یَوۡمِ القِیَامَۃِ، وَمَنۡ سَنَّ سُنَّۃً سَیِّئَۃً فَعَلَیۡہِ وِزۡرُھَا، وَوِزۡرُ مَنۡ عَمِلَ بِھَا إِلَیٰ یَوۡمِ القِیَامَۃِ. رَوَاہُ مُسۡلِمٌ.

موجودہ زمانہ میں ناچنے گانے کو فروغ دینے، اداکاری کا سکہ دلوں پر جمانے اور بے حیائی کو پھیلانے کا کام جو انسٹاگرام اور ان جیسے ایپس نے کیا ہے، تاریخ میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔اس وقت شیطانی نظام اور اسلام دشمنوں کا سب سے بڑا ہتھیار بے حیائی پھیلانے کا جو ہے وہ انسٹاگرام اور اس جیسے دوسرے آپس ہیں۔قرآن اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ. یعنی جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بدکاری کا چرچا ہو، یقیناً ان کے لئے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔

اور جو لوگ اس طرح کی ریلس بنا کر انسٹاگرام وغیرہ پر ڈالتے ہیں درحقیقت وہ گناہوں کی ریل ہے۔اس کا گناہ اس کو مرنے کے بعد بھی اس ریل کی وجہ سے ملتا رہے گا۔اس کے لیے گناہِ جاری ہے۔نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ: مَنۡ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً فَلَہُ أَجۡرُھَا وَأَجۡرُ مَنۡ عَمِلَ بِھَا إِلَیٰ یَوۡمِ القِیَامَۃِ، وَمَنۡ سَنَّ سُنَّۃً سَیِّئَۃً فَعَلَیۡہِ وِزۡرُھَا وَوِزۡرُ مَنۡ عَمِلَ بِھَا إِلَیٰ یَوۡمِ القِیَامَۃِ۔ (رواہ مسلم) جس نے کوئی اچھی سنت (نیک طریقہ) جاری کی، تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اور ان سب کا اجر بھی ہے جو قیامت تک اس پر عمل کریں، اور جس نے کوئی بری سنت (برا طریقہ) جاری کی، تو اس پر اس کا گناہ ہے اور ان سب کا گناہ بھی ہے جو قیامت تک اس پر عمل کریں۔ان ایپس کے ذریعہ فلمی اداکاری کا بھوت بھی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔

جن کے خاندانوں میں کبھی ناچ گانے کو ایک منحوس کام سمجھا جاتا تھا آج انکی نئی نسلوں کے مجلسیں ناچ گانے اور موسیقی اور اداکاروں کے تذکرہ پر مشتمل ہوتی ہیں۔پچھلے دنوں حیاء جن

خواتین کا زیور تھی آج انسٹاگرام پر اس حیا کو سر بازار نیلام وہ خود کر رہی ہیں۔

حدیث میں ہے: إِنَّ الْحَيَاءَ وَالإِيمَانَ قُرِنَا جَمِيعًا ، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الآخَرُ۔ یعنی حیاء اور ایمان دونوں اکٹھے ملا دیے گئے ہیں پس جب ان میں سے ایک کو اٹھالیا جائے تو دوسرا بھی اٹھا لیا جاتا ہے۔

اور یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ انسٹاوغیرہ کے ذریعہ سے بازار عشق بھی بہت گرم ہوا، عشق مجازی اور لو، پیار کے چکر میں پڑ کر ماں باپ کے نام اور اپنی عزت کو بالائے طاق رکھ کر بہت سی ایسی حدوں کو پار کیا ہے جس کو انھیں پار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

وہ نوجوانان اسلام جن کا وصف خاص بہادری، شجاعت اور سنجیدگی تھا جو ایک اچھے شریف ذمہ دار خاندان کے ہوشمند فرد تھے آج اس طرح کے ایپس پر مسخرے اور جوکر بنے ہوئے ہیں، اور ان کو اس پر فخر ہے۔ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک اچھا کام کر رہے ہے۔ اداس دنیا اور اجڑے ہوئے دلوں کی دل لگی کا سامان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا.

کہہ دو کہ: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ کون لوگ ہیں جو اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ دنیوی زندگی میں ان کی ساری دوڑ دھوپ سیدھے راستے سے بھٹکی رہی، اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔

سگریٹ اور تمباکو کی عادت چھڑانا کتنا سخت ہے ہر ایک اس کو جانتا ہے لیکن ان ایپس کی عادت چھڑانا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ والدین بیمار اور، تیمار داری کے محتاج ہیں لیکن اولاد اپنے ہی نشے میں چور ٹک ٹاک اور انسٹا کی دنیا میں مست ہیں۔ یہ والدین اپنی اولاد کی اس لت سے پریشان ہیں، بہت سے والدین نے حالات سے سمجھوتا کرلیا ہے اور اپنی اولادوں کی ان حرکتوں کے آگے مجبور ہوکر ہتھیار ڈال دیے ہیں اور ان کو بے حیائی کے دلدل میں بے حجاب چھوڑ کسی ٹرنگ پوائنٹ کی امید میں ہیں۔ اور اب تو ایسے حیا باختہ والدین کی بھی کمی نہیں ہے کہ جن کا سپورٹ ان انسٹاگرامی بچوں کو حاصل ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسٹا اور اس جیسے ایپس فضولیات، لغویات، فحاشیات، تضییع اوقات، موسوقیات اور ناچ گانوں سے پر ہیں۔

امہات المؤمنین ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے مبارک نام

وقد ذكر الحافظ العراقي رحمه الله أسماءهن بالترتيب، فقال:

أَزْوَاجُهُ اللاتي بهنَّ قَدْ دَخَلْ ...... ثِنْتَا أَوْ إِحْدَى عَشْرَة خُلْفٌ نُقِلْ

خَدِيجَةُ الأُولَى تَلِيهَا سَوْدَةُ ...... ثُمَّ تَلِي عَائِشَةُ الصِّدِّيقَةُ

وَقِيلَ قَبْلَ سَوْدَة فَحَفْصَةُ ...... فَزَيْنَبٌ وَالِدُهَا خُزَيْمَةُ

فَبَعْدَهَا هِنْدٌ أيْ أُمُّ سَلَمَهْ ...... فَابْنَةُ جَحْش زَينبُ المُكَرَّمَهْ

تَلِي ابْنَةُ الحَارِثِ أيْ جُوَيْرِيَهْ ...... فَبَعْدَهَا رَيْحَانَةُ المَسْبِيَهْ

وَقِيلَ بَلْ مِلْكُ يَمِيْن فَقَطْ ...... لَمْ يَتَزَوجْهَا وَذَاكَ أَضْبَطْ

بِنْتُ أَبِي سُفْيَانَ وَهْيَ رَمْلَةُ ...... أُمُّ حَبِيْبَةَ تَلِي صَفِيَّةُ

مِنْ بَعْدِهَا فَبَعْدَهَا مَيْمُونَهْ ...... حِلًّا وَكَانَتْ كَاسْمِهَا مَيْمُونَهْ

وَابْنُ المُثَنَّى مَعْمَر قَدْ أَدْخَلَا ...... فِي جُمْلَةِ اللاتِي بِهِنَّ دَخَلَا

بِنْتَ شُرَيْحٍ وَاسْمُهَا فَاطِمَةُ ...... عَرَّفَهَا بِأَنَّهَا الوَاهِبَةُ

وَلَمْ أَجِدْ مَنْ جَمَعَ الصَّحَابَهْ ...... ذَكَرَهَا وَلا بِأُسْدِ الغَابَهْ

وَعلَّهَا التي اسْتَعَاذَتْ مِنْهُ ...... وَهْيَ ابْنَةُ الضَحَّاكِ بَانَتْ مِنْهُ

وَغَيْرُ مَنْ بَنَى بِهَا أَوْ وَهَبَتْ ...... إِلَى النَّبِيِّ نَفْسَهَا أَوْ خُطِبَتْ

وَلَمْ يَقَعْ تَزْوِيجُهَا فَالعِدَّةُ ...... نَحْوُ الثَّلاثِينَ بِخُلْف أَثْبَتُوا

(ذخيرة العقبى)